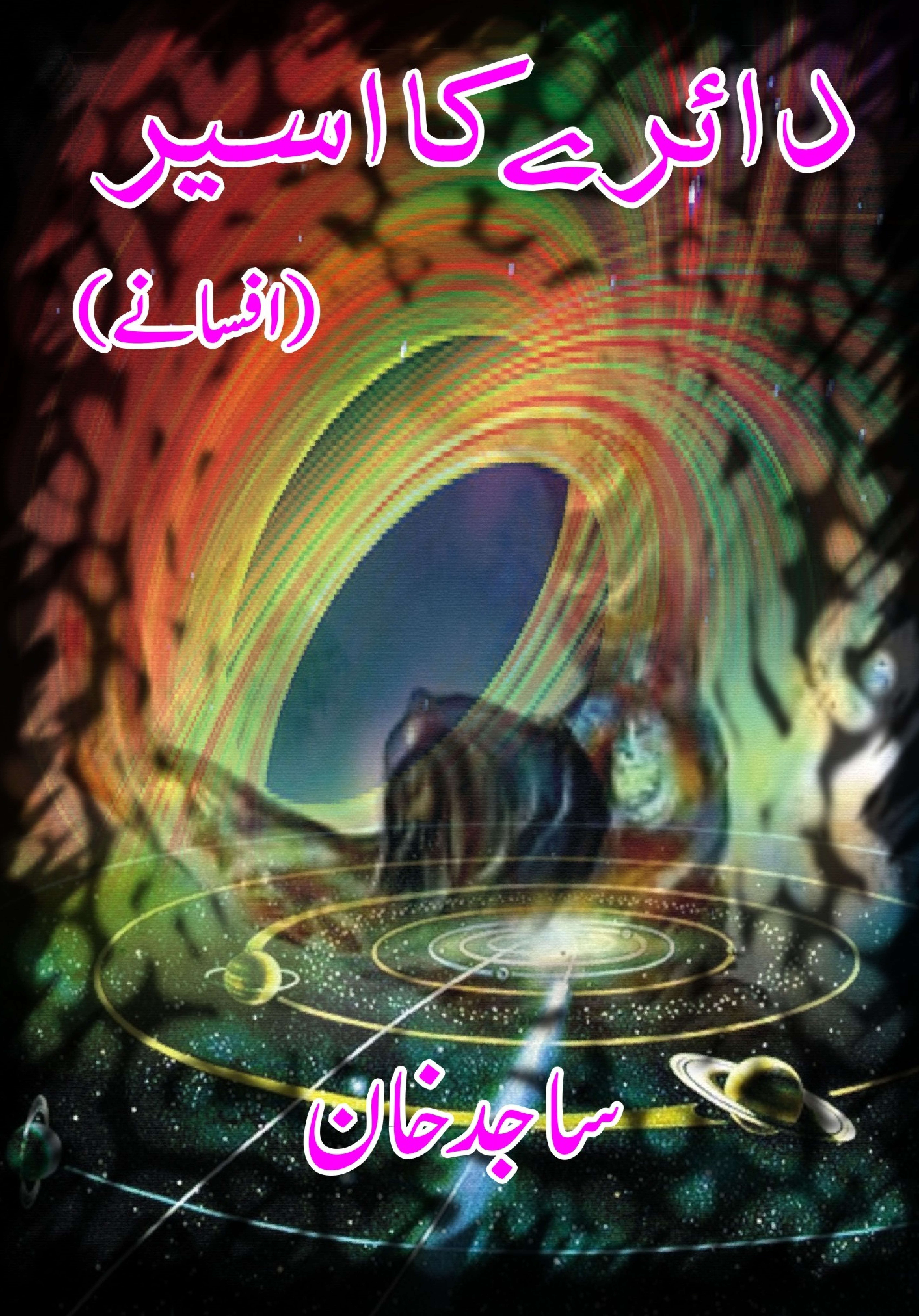
دائرے کا اسیر

(افسانے)



ساجد خان

دائرے کا اسیر

ساجد خان

سُلطَانْ پَبلِشَرزْ

14 قاضی سعید مارکیٹ، ڈھوک سیداں روڈ، کمال آباد–III، راولپنڈی کینٹ

email:bashirranjha18@yahoo.com

اشاعت اول: ۱۸ رمضان المبارک ۲۰۱۴ء

اہتمام محمد بشیر رانجھا

دائرے کا اسیر / ساجد خان

صفحات: ۱۲۸ تعداد: ۵۰۰

قیمت: (اندرون ملک) 250روپے

(بیرون ملک) (برطانیہ)20پاؤنڈز

(امریکہ)40امریکی ڈالر

Dairay Ka Aseer/Sajid Khan

Rawalpindi(Pakistan):Sultan Publishers:2014

128pp.

ISBN 978-969-9965-07-4

ہمارے رابطہ

محمد حنیف مزدور ریلوے اسٹیشن ---- حویلیاں، ضلع ایبٹ آباد

ٹیلیفون: 0300-5050775/0333-5050775

ناشر

سُلطانُ پبلِشرز

14 قاضی سعید مارکیٹ، ڈھوک سیداں روڈ، کمال آباد-III، راولپنڈی کینٹ

email: bashirranjha18@yahoo.com

Ph: + 92 300 5119565

انتساب

(1)

رب کائنات نے جس رشتے کی اپنے نام کے ساتھ مثال دی
''ماں''
اپنی بہت ہی شفیق اور پیاری ماں کے نام
جن کی رب کائنات کے حضور جھولی پھیلا کر اور ہاتھ اٹھا کر
مانگی گئی دعاؤں اور التجاؤں نے مجھ جیسے ناکارہ
کو باعزت اور باوقار بنا رکھا ہے

(2)

لاڈلی بیٹیوں مریم نور اور سلمیٰ نور کے نام

(3)

دوستوں کے نام
جن کی بے غرض اور بے لوث محبت سرمایہ حیات ہے

وقت مل جائے تو آرام سے پڑھ لینا مجھے
اتنی عجلت میں یہ مضمون نہ سمجھ پاؤ گے

(رقیہ غزل------لاہور)

تہذیب

بے بسی......بے چارگی......درماندگی!!!

مجلس میں صاحبانِ علم و فراست جلوہ افروز تھے......ان کی ذہانت اور علمی وقار ان کے چہروں کی بشاشت اور سکون سے عیاں تھا۔

نپے تلے الفاظ اور فصیح و بلیغ جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا......مگر یہ مسئلہ کسی جانب سے ایک رائے آتے ہی مزید الجھاؤ کا شکار ہو رہا تھا۔

ان میں کئی ایسے صاحبانِ فکر و نظر تھے جنہوں نے علم و ادب کی معتبر، ضخیم اور اہم ترین کتب کھنگال رکھی تھیں۔ شرق و مغرب کے علوم سے بہرہ مند تھے......مگر اس مسئلہ پہ وہ بھی اُلجھاؤ کا شکار تھے۔

دُنیا کے بر اعظم، بر اعظموں میں تقسیم ممالک، ممالک میں تقسیم ہر نوع کا علم......مگر اس مسئلہ پر سب خاموش، بے بسی، بے چارگی، درماندگی نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے۔

"سب فانی ہے"......پہلے نے ہتھیار پھینک دیئے۔

"مگر وہ فانی نہیں، ابدی ہے"......سامنے بیٹھے نے احتجاج کیا۔

"ابدی کیسے؟ نہ ٹھکانے کا پتہ نہ مسکن کا تعین؟؟؟ پہلے نے قدرے بلندی سے آواز کا پتھر لڑھکایا۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی اِن سب کے سامنے بھنگڑا ڈالے رہی......مگر وہی! بے بسی!! بے چارگی!!! درماندگی!!!!

کونے میں بیٹھا شخص بحث میں شامل ہوا:

"انسان تعاقب نہیں کر سکتا وہ تو اُس نوالے کا تعاقب کرنے سے قاصر ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے اپنے حلق سے نیچے اتارتا ہے۔ وہ کہاں سے آیا، کن ہاتھوں نے مس کیا، کب بکھرا، کیسے بکھیرا، کہاں

بکھرا، کن ہاتھوں سے بکھرا؟؟؟......کس مٹی نے کوکھ میں لیا، کس بوند نے زندگی سے ہمکنار کیا، کس اوزار سے کٹا، کس نے پیسا، کس نے اٹھایا؟؟؟

کدھر لے گیا، کہاں لے کر گیا، کس نے باندھا، کیسے باندھا، کہاں بندھا؟؟؟

کس نے خریدا......کیسا خریدا......کہاں سے خرید......؟؟

کس نے پہنچایا، کہاں پہنچایا، کیسے پہنچایا؟؟

کس نے گوندھا، کس نے پکایا، کون کھائے گا اور کب کھائے گا؟؟؟"

وہ جو کافی دیر سے خاموش، گم سم اور اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا، کونے والے کو غور سے دیکھنے لگا!!!

چاروں طرف سے بے ہنگم سا شور اٹھا اور اُٹھتے ہی اچانک خاموشی پھیل گئی۔

دائیں طرف بیٹھا شخص کچھ کہنے کو تھا کہ پہلے نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ وہ مصر تھا کہ "سب فانی ہے"

ایک جانب سے آواز آئی "ابدی ہے"۔

دُوسری طرف سے "فانی ہے"

بے ربط آوازیں کمرے میں گونج گئیں۔

فیصلہ کیسے ہو؟ فیصلہ کون کرے؟؟ حل نہیں مل رہا......کوئی فیصلہ کن دلیل نہیں آ رہی تھی...... سبھی الجھاؤ کا شکار۔

خاموشی نے کھتک ناچ شروع کر دیا۔

"سمندر میں سکوت اور وقار ہے......ندی میں شور اور چھچھورا پن"

اُس نے پہلی بار زبان کھولی تھی......مگر اُس کی ناک میں بیٹھا شخص بھلا کب چوکنے کے حماقت کرتا، اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

"مگر سمندر بھی تو انہی ندیوں کے ہونے سے سمندر ہے"......

"ندیاں نکال دو......سمندر کہاں؟؟؟ قطرے کی کیا اوقات......کہ اُس میں دجلہ دکھائی دے؟؟؟" اُس نے فوراً پینترا بدلا۔

"ہاہاہا......عجیب بات کرتے ہو صاحب! سمندر سے سارے قطرے نکال دو......پھر سمندر کہاں؟"......اب کے ناک میں بیٹھا زیرِ لب مسکرایا۔

دائیں جانب بیٹھا آخر کہہ اٹھا "ہم نجانے کن مسائل میں بھٹک رہے ہیں......سب کہتے ہیں پڑھو۔مگر کیا پڑھیں؟اسلامیات،سیاسیات،معاشیات،طبیعات،عمرانیات،فلکیات؟"

ان سے کچھ فاصلے پر گہری سوچ میں ڈوبے شخص نے احتجاج کا پتھر لڑھکایا۔پڑھتے نہیں تو پھر فن سیکھو......

"فن......کونسا فن؟؟......وہ تو دھوکا ہے"

کیا فن نہیں پڑھا جاتا......؟؟؟ سامنے بیٹھے نے احتجاج کی چوٹ سہلاتے ہوئے رائے دی......"یہ نہیں کرو گے تو وہ ہو گا،ایسا نہ ہوا تو ویسا ہو گا،سب جھوٹ!اجزا جھوٹ،سفید جھوٹ،ننگا جھوٹ،مضبوط بنانا،درمیان سے اُٹھانا،ذرہ ہٹ کے تھوڑا اُونچا،قدرے کشادہ،ورنہ خوبصورت نہیں دیکھے گا۔یہ سب ذہنی اختراعات ہیں جن کی کوئی اصل نہیں"وہ سب کو گھورتے ہوئے بے محابا کیے جارہا تھا۔

سمندر کی خاموشی،خاموشی میں پراسراریت،پراسراریت میں انجانا خوف......خوف میں سسکتے لمحے لمحوں میں گزرتا وقت،وقت کیا ہے؟؟؟ کوئی بتائے تو؟؟؟

محض ایک گورکھ دھندہ،جو یہاں کچھ ہے وہاں کچھ،یہاں ایسے جیسے ہاتھ سے پھسلتی ریت!!!

چھوڑو اس بحث کو اس کا حاصل کچھ نہیں،بائیں طرف بیٹھا ہکلاتے ہوئے کہنے لگا،اچھا اس کا بتاؤ،وہ کہاں ہے......؟؟؟

وہ......وہ تو مر چکا ہے"

"ہائیں!کب؟کہاں،کیسے؟؟"جواب سنتے ہی افسردگی اس کے چہرے پر چھا گئی۔

"نہیں جناب!وہ مرا نہیں وہ تو زندہ ہے......البتہ اس کا جسم اوجھل ضرور ہو چکا ہے"

ہاں!......"قاعدہ یہی ہے......پیدائش......بڑھوتری......جوانی......بڑھاپا اور پھر سفر،کوئی قدرے شروع میں،کوئی درمیان سے تو کوئی آخر پر......یہ سفر ضرور شروع کرتا ہے۔سب وقت کا گورکھ دھندہ اور لکھے کا کیا دھرا ہے میاں"......سمندر کی بابت بات کرنے والا شخص چہکا۔

"تم تو پاگل ہو"اس نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔

"میں ـــ میں پاگل نہیں......میں حقیقت پسند ہوں۔میں نے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کیا ہے حضور!والد نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ بیٹا علم میں عظمت ہے۔کتاب اصل دوست ہے۔میں نے کتابیں تھامیں......علم حاصل کیا اور بے موت مار دیا گیا......آج سب مجھ پر نوحہ کناں ہیں......کیا اپنے کیا بیگانے......"

”تم جھوٹ بول رہے ہو!......تم نے علم سیکھا ہی نہیں ......تم دنیاداری میں غرق رہے ہو...... صرف نام ونمود کی خاطر......اپنی ذات میں گم......تم تو اپنے ہی حصار کے قیدی رہے ہو“ سامنے والے نے جھنجھناہٹ سے کہا۔

نہیں! نہیں!! یہ مجھ پہ الزام ہے......جھوٹ ہے......سارا جھوٹ“

”میں وقت کو نہیں مانتا......یہ گورکھ دھندہ ہے......جسم کی کوئی حیثیت نہیں، یہ فانی ہے“

”میں ابدی ہوں“ وقت کی قید سے آزاد......“

”بس بس!! تمہارا دماغ چل گیا ہے......تم سے پوچھا کچھ جاتا ہے......تم جواب کچھ دیتے ہو......جاؤ......اپنے خبط کا علاج کراؤ“......داہیں طرف بیٹھا اب کے برس پڑا۔

”ہاہاہا......کس سے؟......معالج سے......وہ تو مفروضوں پہ مبنی علم کے زور پر علاج کرتا ہے......جو اصل نہیں فرع ہے جبکہ میں اصل کی تلاش میں ہوں......مجھے اصل نہیں مل رہی۔ جب اصل ملے گی تو یہ علاج بھی بے معنی ہو نگے“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”تم بے چین ہو......اضطراب تمہارے وجود میں سرایت کر چکا ہے......عقل سے کام نہیں لیتے......علم پہ تمہارا عمل نہیں......جاؤ اسے ڈھونڈ و اصل مل جائے گا“......داہیں طرف بیٹھے نے بے ساختگی سے کہا۔

”اُسے ڈھونڈوں......؟؟ کہاں ڈھونڈوں......؟؟“ اب کے وہ اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

”مخلوق کی محبت میں......“ داہیں طرف بیٹھے نے جواب دیا۔

”محبت......محبت تو کہیں بھی نہیں جناب! اِس لفظ کو آپ لوگوں نے اتنا گھسیٹا کہ اس کی حرمت ہی ختم ہو چکی ہے......جب حرمت ختم ہو جائے تو اثرات بھی نہیں رہتے اور میں بے اثر اور بے روح چیزوں کو پسند نہیں کرتا......میں صرف اصل کا سراغ چاہتا ہوں......اصل کو پا لینے کے لئے مجھے اب کسی جزو میں بھی نہیں پڑنا“۔

”خدا کے لیے اب خاموش ہو جاؤ!“ سامنے بیٹھے نے التجا کی......

”میں خاموش نہیں رہوں گا......میں سب کو بتاؤں گا کہ سب نقلی ہے......یہ وقت بھی ایک گورکھ دھندہ ہے جو طے ہے اُسے وقت میں مقید کرنے کا کیا فائدہ......جب میرے دانت نکلے تو کتنے مضبوط تھے......دیکھو غور سے دیکھو......آج یہ ٹوٹ رہے ہیں......یہ میرے بال دیکھو......لمبے گھنگھریالے تھے آج یہ جھڑ رہے ہیں......میرا توانا اور مضبوط جسم ڈھیلا اور کمزور ہو چکا......میری

بینائی......آہ! آج دھندلا رہی ہے......سب نقلی ہے......وہ بھی اور یہ بھی......طے شدہ کو وقت کا لبادہ دے دیا گیا......میں نے نقل کے ساتھ زندگی گزار دی......اصل کا پتہ ہی نہ چلا......" وہ بے تھکان بولے جارہا تھا۔

"ساری کتابیں......سارے علوم......سارے فنون......بھی تو اصلی نہیں......اصل کیا ہے......؟؟؟......وہ سوالات کرنے لگا جو کچھ دیر پہلے تمسخر اڑا رہا تھا۔

"ہاہاہا!......اصل صرف وہ ہے......جسے کوئی ڈھونڈتا نہیں......اُسے پالو گے تو سمجھو اصل تمھیں مل گیا......تم سارے صرف اس کے پھیلائے میں گم ہو"۔

"میں آج بھی اُسے ہی ڈھونڈ رہا ہوں......کبھی اپنے اندر کبھی اپنے باہر تم بھی اُسے ڈھونڈو......تمہیں پتہ چل جائے گا کہ اصل کیا ہے......؟؟......نقل کیا ہے؟؟......میں اپنے اندر جھانکتا ہوں وہاں ایک وسیع دُنیا آباد ہے۔میں اُس دُنیا کو دیکھ کر حیران ہوگیا ہوں......میں نے دریافت تو کرلی پر شناخت نہیں کرپا رہا تم بھی اُسے ڈھونڈو"۔

"وہاں تم نے کیا دیکھا؟......اُس نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا۔

"وہاں......وہاں صرف زبر......زیر......اور پیش ہے......جو ان کو سمجھ گیا......جزم اُس نے اپنالی......پھر تشدید نے اُسے اپنے ساتھ جوڑ لیا"۔

"اوہو! شاید تم نے اپنی روح دیکھ لی ہوگی!" سامنے بیٹھا تمسخر اڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں......نہیں! یہ روح نہیں کئی اجسام ہیں......تم نے اصل پانا ہے تو پہلے نکتے کو ڈھونڈو......نکتہ وسیع دُنیا میں ایک نقطے کے برابر ہے......اُسی نکتے میں طاقت کے سارے سرچشمے ہیں......وہاں ارتعاش ہے......حرکت ہے۔آندھیوں کی طرح تیز ہوائیں ہیں۔اُن میں آوازوں کی بازگشت ہے......آوازوں کو سنو......تب جان جاؤ گے......اصل کیا ہے؟"

"تم جس پائیداری کی باتیں کرتے ہو وہ تو فانی ہے"۔

"کیا تم نے وہ دیکھا؟ وہ جو جسم سے نکل کے ہوا کے دوش پر نجانے کدھر چلا گیا تھا اور تم......تم سارے فرع کو دیکھ کر چلائے جارہے تھے اور مسلسل چلائے جارہے ہو"

"تم مانتے ہی نہیں۔تم ایسے ہی چلاتے رہو گے......جب اصل ملے گا تب سکون اور ٹھہراؤ پاؤ گے۔تمہاری دسترس میں اتنا ہی ہے جتنا تمہیں ودیعت کیا گیا۔اس کے آگے الجھاؤ ہے۔بے بسی ہے بے چارگی ہے، درماندگی ہے......اصل تک رسائی سے سب قاصر ہیں، قاصر ہیں، قاصر ہیں!!!"......وہ

دیوانہ وار جھومنے لگا......سب آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھے جا رہے تھے۔

مُکافاتِ عمل

"میری بات سنو!......میں حقیقت پسند انسان ہوں......" اگلے ہی لمحے وہ سوچنے لگا کہ حقیقت تو تلخ ہوتی ہے۔

"دیکھو میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔۔۔میرا معاشرے میں ایک مقام ہے۔۔۔اور تم جیسی عورت میری بیوی نہیں بن سکتی"

"خدارا بس کرو......بس! مجھے روز روز ذلیل نہ کیا کرو"۔ وہ بات سننے سے انکاری تھی۔

"تم کیسی عورت ہو؟......" وہ چلایا۔

"کیوں کیسی ہوں میں؟ تم سے ملتی ہوں تو کیا میں سارے زمانے۔۔۔"

بس......بند کرو یہ ڈھونگ اب۔ کہ وہ غصے میں تھا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں......تمہاری بن کے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اس میں کیا قباحت ہے؟؟؟"

"اوہو! تمہاری یہی بات تو میری سمجھ سے بالاتر ہے......میں سوچ سوچ کے ہلکان ہو رہا ہوں......دیکھو وہ دَور کب کا گزر چکا......جب لوگ محبت کی کہانیاں پڑھا کرتے تھے......محبت کے نام پہ سرور حاصل کرتے تھے......اور حقیقت سے دُور کہیں خیالی دُنیا آباد کر کے گھوما پھرا کرتے تھے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ اب یہ سب باتیں بے معنی ہیں"......وہ اپنا دامن چھڑانے لگا، جسے اُس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"دیکھو......مجھے نا چھوڑو!......میں تم سے محبت کرتی ہوں، تمہارے بن رہ نہیں پاؤں گی......" وہ لجاجت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔

"یہ سب جھوٹ ہے......تمہیں کسی سے محبت نہیں تم جیسی عورتیں کسی کی بھی نہیں ہوتیں اور نہ ہی محبت جیسے جذبے کو سمجھ سکتیں ہیں"

"بخدا میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں......جو تم سوچ رہے ہو ایسی کوئی بات نہیں......میں صرف......"

"خاموش! مجھے یہ جذباتی کلمات بالکل پسند نہیں"

"میری پوری بات تو سنو!......دیکھو......"

وہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ اُسے پھر اس کی ضرورت پڑے گی......اس کی عادت تھی کہ وہ جب بھی اس کے طلسماتی بدن کے لمس سے حظ اُٹھاتا......تو کسی نہ کسی پل ضرور اُس سے جھگڑ بھی پڑتا......کچھ دن دونوں طرف خاموشی رہتی......اور پھر دونوں کو ایک دوسرے کی طلب قریب لے آتی......مگر آج تو اس نے کچھ زیادہ ہی کہہ دیا تھا جس کا اُسے احساس بھی ہو رہا تھا......اُس کا نیم عریاں جسم اور سڈول خدوخال دیکھ کر ایک بار پھر اس کے باطن میں چھپے درندے نے انگڑائی لی......مگر اُس کے اندر کہیں دُور چھپے ایک مہذب انسان نے اُسے سختی سے دبوچ لیا......وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔

"یہ کیسی عورت ہے؟ پہلے مجھ پر ڈورے ڈالے اور اب تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے......شادی کرو......شادی کرو......تمہارے بنا رہ نہیں سکتی......اُف میرے خدایا......کس قدر بے حیا اور بے شرم ہے" ......وہ واپسی پہ تمام راستے یہی سوچتا رہا۔

"بے حیا اور بے شرم......' لفظ ذہن میں آتے ہی وہ سہم سا گیا۔

"کیا میں بھی اُس جتنا بے حیا اور بے شرم ہوں؟"

"......نہیں! نہیں!!......میں ایک عزت دار خاندان کا باوقار فرد ہوں......میری معاشرے میں قدر ہے، لوگ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں......" اُس کے دِل اور دماغ کے بیچ ایک جنگ چھڑ گئی......مگر اس کا جواب اس کا ضمیر قبول کرنے سے انکاری تھا......وہ سامنے ہوٹل میں جا بیٹھا۔

"جی جناب!......کیا چاہیے......ٹھنڈا؟ چائے؟؟؟" ......بیرے نے پوچھا۔

"چائے لے آؤ"

بیرا چائے لینے گیا تو گزرے لمحات دُوبارہ اُس کی سوچوں میں دَر آئے۔

"ہمیں حقیقت شناس ہونا چاہیے"۔ حقیقت کا لفظ سوچتے ہی وہ کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔

"اِس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ مجھے حقائق سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ میرا کیا

قصور ہے؟۔مجھے تو خود اس نے۔۔۔۔۔" وہ اپنے آپ کو تسلی دینے لگا۔اُسے چند لمحے پہلے کے واقعات تسلسل سے یاد آنے لگے۔جب وہ اُسے اپنے ہی جسم کا حصہ بنائے۔چڑھتی، پھولتی سانسوں کے درمیان زندگی بھر ساتھ گزارنے کے وعدے کر رہا تھا......وہ اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے حصار میں خودسپردگی کی تمام حدیں عبور کر گئی تھی۔

"چائے! صاحب"......بیرے نے ایک بار پھر اُس کی خیالات میں خلل ڈالا۔

"اچھا......ٹھیک ہے"......وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

"میرے کتنے روپ ہیں؟......میری اصلیت کیا ہے؟ کیا میں کمینہ ہوں؟" وہ کسی خیال کے زیرِ اثر سوچنے لگا۔

قدرے سوچنے کے بعد وہ خود کلامی کرنے لگا......"میں بے حد جذباتی ہوں۔ایسی بھی کیا بے حسی، جب تک بات بن رہی ہے......بنی رہے......عورت اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے تو کچھ بھی کر سکتی ہے......جب وہ خود مان رہی ہے تو مجھے کیا پڑی کہ اُسے دھتکار دوں"......اِس خیال کے آتے ہی وہ اپنے آپ کو حد درجہ بے وقوف اور جذباتی سمجھنے لگا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ اُسے بے حد چاہتی ہے......مگر کیوں؟

شاید اس کے پیار کرنے کا انداز ہی ایسا تھا......نہیں شاید اُس کے لفظوں میں جادوگری تھی۔جن کے سحر میں گرفتار ہو کر وہ سب کچھ بھول بیٹھی تھی......لفظ......ہاں لفظ کتنے پرتاثیر ہوتے ہیں جو انسان کو بدل دیتے ہیں۔کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟ شاید ہاں! مگر نہیں یہ محبت نہیں ہو سکتی......یہ ہوس اور دَرندگی ہے......دونوں کی بڑھتی ہوئی ہوس......جس نے سوچنے سمجھنے کی حس کو ہی ختم کر دیا۔

"جو بھی ہو......مگر ہے بہت ہی دِلنشیں......" وہ زیرِ لب مسکرایا۔اُسے اپنے جسم میں ایک انجانی سی لہر اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔جس نے اسے ہلکا پھلکا کر دیا۔

بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر گیا......وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔کبھی نوک جھونک ......کبھی گلے شکوے......کبھی پیار محبت اور کبھی ناز و انداز......کئی سال گزر گئے ایک دِن اس نے باتوں باتوں میں پوچھا......"کیا ساری زندگی اسی طرح گزارو گے؟"

"کیوں کیا ہوا؟"......اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ نا! تم مجھے کب اپنا رہے ہو؟......" وہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگی۔

میں نے تمھیں اپنانے کا وعدہ کب کیا تھا؟......اس نے قدرے بیزاری سے کہا

''کیا کہا؟؟'' ......اُس نے جھنجھلا ہٹ سے پوچھا۔

''میں نے تمھیں اپنانے کا وعدہ کب کیا تھا'' ......وہ الفاظ مٹھار کر کہنے لگا۔

''وعدہ تو تم نے کیا تھا'' ......وہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''کیا ہوگا ......مگر مجھے یاد نہیں'' ......اُس نے بے رخی سے جواب دیا۔

''کیا تم مجھے نہیں اپناؤ گے؟'' ......اب کے اس نے دُوٹوک جواب مانگا۔

''نہیں! کبھی نہیں ......کبھی بھی نہیں!!!''

''مگر کیوں؟ ......''اُس کے لہجے میں حیرانگی کے ساتھ کرختگی بھی دَر آئی تھی۔

''اپنانا انسان عورت کو ہے کیا تم اپنے آپ کو عورت سمجھتی ہو؟''

''کیوں میں عورت نہیں؟'' ......اُس نے کلبلاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تو نہیں لگتا'' ......اُس نے بے دھڑک جواب دیا۔

''اور تم کیا ہو؟؟؟'' ......وہ چلانے لگی

میں ......؟؟ ......ہاں تم ......اُس نے رنجیدگی سے کہا۔

میں اِس معاشرے کا عزت دار آدمی ہوں۔

عزت دار اتم تو انسان بھی نہیں ہو۔ درندے، حیوان، بھیڑیے ......وہ رونے لگی۔

''تم نے محبت کے نام پر مجھے دھوکے میں رکھا اور میرا جسم بھنبھوڑتے رہے ...... پاجی انسان! ......تم پر تو اللہ کا غضب نازل ہوگا۔

تمہارے اِس کرتوت نے کوئی اور رنگ دکھا دیا ہوتا تو ؟؟؟؟'' کیا یہ صرف میرا کرتوت ہے؟؟؟ ......''ہاں صرف تمھارا ......

اکیلا چنا بھاڑ نہیں بنا سکتا وہ طعنے دینے لگا ....اس طرح مجھ سے بات کرتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے۔

بس بس رہنے دو''میں نا ہوتا تو کوئی ......بس خاموش ......چپ ہو جاؤ......اب آگے کا ایک لفظ بھی نا بولنا۔

''تم انتہائی غلیظ اور کمینے انسان ہو''وہ آگ بگولا ہو گئی تھی

ہا ــ ہا ــ ــ ہاہا ......! ......اور تم جو پورے ملک میں سماجی کاموں کی ٹھیکیدار بنی بیٹھی ہو ......کبھی یہاں کبھی وہاں پڑاؤ لگاتی پھرتی ہو ......کل کس کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

شرم کرو......اگر تمھیں مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں تھا تو مجھے ......

بس بس......تم شرم نا کرنا ......بے شرم بے حیا.............وہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔

یہ سننا تھا کہ وہ بھی آپے سے باہر ہو گی اور بد دعائیں دینے لگی۔

بد دعائیں سنتے ہی اچانک اُس نے چہرے پر تھوک دیا۔

بے شرم بے حیا تمھاری یہ اوقات ہے......ہاں ہاں ......اب جو مرضی الزام لگاؤ تم نے میرے ساتھ کھلواڑ کیا تم یاد رکھنا تم کبھی سکون نہیں پاؤ گے ......

ملک وقار کی بیوی جہیز میں بہت سی دُولت ساتھ لائی تھی ......بیٹوں کو دیکھتا تو روح میں تازگی اور طمانیت پاتا محبت اور وارفتگی سے چہرہ کھل اٹھتا۔مگر بیوی کی اچانک جدائی نے اُسے آنا فانا تنہا کر دیا وہ اندر ہی اندر تذبذب اور بے قراری کا شکار تھا......وقت کے ساتھ تنہائی کا احساس بھی بڑھتا گیا۔دن تو کاروباری جھمیلوں میں گزر جاتا لیکن رات کاٹنے کو دوڑتی کبھی کبھی اُسے اپنے بھی اپنے نا لگتے ......ملک وقار کے بعض قریبی دوستوں نے دُوسری شادی کا مشورہ دیا......جو دِل کو لگا اور ملک وقار نے ایک بڑے بیوروکریٹ کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لی ......پڑھی لکھی بیوی کے آنے کے بعد اس کی سماجی زندگی میں بھی انقلاب آ گیا ......بیگم وقار ہر محفل کی جان ہوتی ......گھر میں ہر پانچویں ساتویں روز کسی نہ کسی بہانے سے ایک پارٹی کا اہتمام کیا جاتا جس میں نامی گرامی ہستیاں شریک ہوتیں ......ملک وقار اور اُس کی بیگم کے اثر ورسوخ کی بدولت ان کے کاروبار میں بھی بڑی تیزی سے وسعت آ رہی تھی ......سماجی تعلقات میں پھیلاؤ اور دولت میں دِن دگنی رات چوگنی اضافہ ہو رہا تھا......شہر کے مرکز میں معروف رہائشی سکیم میں دس کنال پر نیا گھر بنایا گیا ......جہاں زندگی کی سب آسائشیں میسر تھیں......کون سی نعمت تھی جو اس کا مقدر نا ٹھہری تھی۔

سانحہ ۸ اکتوبر برپا ہوا تو ملک وقار ایک غیر ملکی دورے پر تھا......علاقے کا پوری دنیا سے مواصلاتی رابطہ منقطع تھا ......اُسے بھی الیکٹرونک میڈیا سے اس تباہی کے بارے میں علم ہوا......پوری دُنیا کا میڈیا چیخ چیخ کر عالمی ضمیر کو جگا رہا تھا......ملک وقار کو اپنے بیٹوں اور بیوی کی کوئی خبر نہ تھی......وہ شدید پریشانی کے عالم میں اپنا دورہ ادھورا چھوڑ کر پہلی دستیاب فلائٹ سے اسلام آباد پہنچا......اسلام آباد سے مظفر آباد تک کوہالہ سے آگے تمام راستے بند تھے......بالاکوٹ ملیامیٹ ہو چکا تھا......اور اس سے آگے مظفر آباد تک تمام سڑکیں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے مکمل طور پر بند ہو چکی تھیں ......ملک بھر سے گاڑیاں منوں ٹنوں کے حساب سے سامان لئے مظفر آباد، بالاکوٹ اور گردونواح کے علاقوں کے

لئے روانہ ہو چکی تھیں ......راولپنڈی سے آگے شدید ٹریفک جام تھا...... ملک وقار اپنی گاڑی میں پانچ گھنٹے میں ایبٹ آباد پہنچا......رات ڈھل چکی تھی......کبھی رُوتا کبھی دِل کو ڈھارس دیتا اور کبھی لوگوں کی زبانی ملنے والی اطلاعات کو سن کر مردنی سی چھا جاتی ......ایبٹ آباد سے مانسہرہ تک ایک بار پھر روڈ بلاک تھا......ساری رات بارش برستی رہی ......اور زلزلے کے آفٹر شاکس بھی جاری رہے......ملک وقار نے پوری رات اپنی گاڑی میں گزاری اور صرف سات کلومیٹر کا فاصلہ طے ہو سکا۔ تیسرے دن وہ مظفر آباد کے قریب پہنچا تو وہاں کا نقشہ بدل چکا تھا......بڑے بڑے محلات اور کوٹھیاں ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں ...... جہاں شہر تھا وہاں محض کھنڈرات تھے......چند ایک جگہ خیمہ بستیاں قائم ہو چکی تھیں اور باقی جگہوں پر لوگ کھلے میدانوں میں بیٹھے امدادی سامان کی انتظار کر رہے تھے......بارشوں نے الگ تباہی مچا رکھی تھی ......عمومی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اُسے کسی کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی ......اُسے بتایا گیا کہ بے شمار زخمیوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے دوسرے شہروں میں منتقل کیا جا چکا ہے...... ہر جگہ لاشوں کے انبار تھے......کوئی اپنے پیاروں کو سپردِ خاک کرنے میں لگا تھا تو کوئی ان کی لاشیں تلاش کر رہا تھا......کہیں امدادی کارکن کھدائی میں تو کہیں خیمہ بستیاں قائم کرنے میں مصروف تھے...... اسٹریچروں پر رکھے انسانی اعضاء اور معصوم بچوں کی لاشیں ...... اور فضا میں سوگواری......چاروں طرف آہ و بکا اور چیخ و پکار کا منظر......ایک قیامت بپا تھی۔

ملک وقار ایک پتھر سے پشت لگا کر بیٹھ گیا......کوئی شناسا چہرہ......کوئی شناسا صورت نظر نہ آئی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا...... دو نوجوان بیٹوں اور بیوی کے چہرے بار بار یاد آتے......نا اُمیدی اور بیقراری کی کیفیت میں اپنے بال نوچنے لگا......کہ اچانک ایک شخص نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"صبر کرو بھائی ......لفظوں میں مُلائمت تھی"

صبر......کیسے ہو صبر......؟؟" کیسے کروں صبر......؟؟ نجانے وہ کہاں ہوں گے......پتہ نہیں وہ ہیں بھی کہ نہیں......ملک وقار کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے......

کتنے افراد تھے......اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا

"تین"......ملک وقار کی نظریں فضاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں

"بچے تھے؟"......اُس نے افسردگی سے پوچھا

"بیوی اور دو بچے"......یاسیت کے گرداب میں غرقاب کہنے لگا

”سامنے میڈیکل کیمپ ہے......وہاں سے پتا کیا......؟؟؟“

”......نہیں......“

”وہاں سے پوچھیں......شاید کوئی خبر مل جائے......

ملک وقار کو کچھ حوصلہ ہوا......تو کیمپ کی طرف چل پڑا......ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ نقاہت سے چکر آیا اور گر پڑا......ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے سہارا دے کر کیمپ تک پہنچایا......کیمپ کے ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھی تو ایک اسٹریچر پر لٹا دیا......زمین پر گرنے سے اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے جو اُس کی حالت کو مزید خراب ظاہر کر رہے تھے......تھوڑی دیر بعد اُسے پانی پلایا گیا......پانی کا پہلا گھونٹ جیسے ہی حلق سے نیچے اترا تو اُسے پھندا لگ گیا......پانچ دنوں کی بھوک اور پیاس کے بعد پانی حلق سے نیچے اُترنا مشکل ہو رہا تھا......حالت کچھ سنبھلی تو اس نے کیمپ والوں سے اپنے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھا......سب نے لاعلمی کا اظہار کیا......کہ اچانک ایک لڑکا بول پڑا......اصغر وقار اور اسلم وقار......دو دن پہلے اٹک کیمپ منتقل ہو چکے ہیں...... دونوں شدید زخمی حالت میں تھے نگران کی والدہ تو وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا............ملک وقار کو زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی......اور بے ہوش ہو گیا......ایک گھنٹے بعد اسے جب ہوش آیا تو دیوانہ وار اپنی گاڑی کی طرف بھاگ پڑا۔

ملک وقار دوسرے روز اٹک پہنچ گیا......اٹک میں ایک وسیع میدان میں خیمہ بستی قائم تھی......ہر طرف زخمی اور کٹے پھٹے انسان پڑے تھے سرکاری اہلکار اور امدادی کارکن امداد میں مصروف تھے......وہی مظفر آباد والا......آہ و بکا کا منظر......ہر طرف چیخ و پکار......ڈاکٹر اور نرسیں زخمیوں اور بیماروں کی مرہم پٹی کر رہے تھے......وہ ایک ایک بستر کے قریب جاتا......زخمیوں اور بیماروں کے چہرے دیکھتا......اپنے بچوں کو تلاش کرتا رہا مگر اُسے کہیں بھی نظر نہ آئے......ایک جگہ قدرے زیادہ رش لگا تھا...... ملک وقار نے وہاں جھانکا تو وہاں ایک خاتون اس کے بیٹے کی مرہم پٹی کر رہی تھی......ملک وقار نے بھیڑ کو چیرتے ہوئے سفید کپڑوں میں ملبوس سماجی کارکن سے کہا......”تم انسان نہیں فرشتہ ہو“تم جیسی فرشتہ سیرت ہی لوگوں کے زخموں پہ پھاہا رکھتی ہیں......اس سماج کو تم جیسی ہی عورتوں کی ضرورت ہے۔

سماجی کارکن پیچھے مڑی......نظروں کا ملنا تھا کہ ملک وقار کو اپنے الفاظ طمانچے کی صورت چہرے پر محسوس ہوئے......غیر دانستہ اُس کا ہاتھ اپنے چہرے پر جا لگا......اُسے ایسے محسوس ہوا سارا

چہرہ تھوک سے بھرا ہوا ہے......اُس سے وہ خود کو کسی کنویں میں اُترتا محسوس کرنے لگا۔

دائرے کا اسیر

کچھ دنوں سے میں عجیب سے خیالات کے زیر اثر تھا......اکثر بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوتا کہیں دُور خلاؤں میں گھوم رہا ہوں......

مجھے لگنے لگا کہ وہاں بہت سی اور دنیائیں آباد ہیں......جن کی کھوج ہم نے ہی کرنی ہے......جن کے خط و خال بے حد خوبصورت تھے......من چاہا کہ چھولوں......سوچتے ہی جسم میں ایک لہری کوندگئی......نجانے کس لمحے میرے اندر سویا سوکر جاگ اٹھا......میں نے لمس محسوس کیا اور جسم کا حظ اٹھاتے ہوئے انجام کو جا پہنچا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دُنیا میں جانور انسانی شکلوں میں بھی موجود ہیں......انسانوں میں اور بھی بہت سی قسمیں ہیں......بعض تماشا دیکھتے ہیں......بعض تماشا بناتے ہیں اور بعض تماشا بنتے ہیں۔

تم کون ہو؟......اُس نے اچانک سوال داغ دیا۔

م......مے......میں......میں بہروپیا ہوں۔

واقعی......؟......وہ قدرے حیرانی سے پوچھنے لگا۔

ہاں......اِس میں حیرانی کی کون سی بات ہے......؟؟؟

وہاں کیا ہو رہا تھا؟؟......اُس نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

وہاں کتے بھونک رہے تھے......

چوزے کے پیچھے بلونا اور بلوٹے کے پیچھے پلا بھاگ رہا تھا......بچھیرا بچھیری کو پکڑنے کی کوشش میں تھا وہ سرپٹ دوڑ رہی تھی......سامنے لومڑیاں آپس میں چھیڑ خانی کر رہی تھیں......بندر اُنھیں

دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے......چڑیاں شور مچا رہی تھیں......کوے اپنی ہی دُنیا میں مگن تھے......گدھے لمبی تانے سو رہے تھے......قدرے دُور ایک جانب سور بھی کھڑے تھے......جب کتے زور سے بھونکنا شروع ہوئے تو میرے اندر بیٹھا کتا بھی جاگ اُٹھا اور بھونکنے لگا۔

وہ کیوں بھونک رہے تھے؟......وہ تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

وہاں ایک کتے کی موت ہوئی تھی۔

پھر......؟؟؟......اُس نے استفسار کیا۔

پھر ایک کتے کے بدلے تین انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

مسئلہ کیا تھا......؟......وہ دلچسپی لینے لگا تھا......مسئلہ صرف ہٹ دھرمی کا تھا۔

ایک کتے کے بدلے تین قیمتی انسانی جانوں کا بے دریغ قتل؟؟......وہ مضطرب سا ہو گیا تھا۔

کیا اِسکے علاوہ بھی کوئی عداوت تھی؟؟......سوال کرتے وقت اُسکا چہرہ مغموم سا نظر آ رہا تھا۔

نہیں اور کوئی بات نہ تھی......جواب سن کے اُس کے چہرہ حیرت زدہ ہو گیا

اُنکے آپس کے تعلقات کیسے ختم ہوئے......اُس نے تعلقات بارے سوال داغا

یاد رکھو......تعلقات فطرتی طور پر کبھی بھی ختم نہیں ہوا کرتے......اِن کا ہمیشہ قتل ہوا کرتا ہے اور اس قتل کی وجہ ہمارے رویئے، جھوٹی انا، جذباتیت، مفادات اور دوسروں کو کمتر سمجھنا ہوا کرتا ہے

......

دوسری طرف اچانک زور سے دستک ہوئی......میں نے پوچھا کون؟؟......نجانے کیوں اس سمے میری آواز لرزی گئی تھی......کوئی جواب نہ پا کر میں فکرمند ہوا شائد وہ لوگ میرا تعاقب کر رہے تھے......میں جلدی سے اٹھا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔مسلسل دوڑنے کے بعد ستانے کے لئے ٹھہرا......پیچھے مڑ کے دیکھا......تو ایک لمبا قد......مضبوط جسم......میرے تعاقب میں تھا۔اس کی جانب دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی......وہ بے چہرہ تھا......!!!

خوف کے مارے میرا جسم نڈھال ہونے لگا میں ہانپتا کانپتا سرپٹ دوڑنے لگا......

وہ کیا چاہتا تھا؟؟......میں نے بھاگتے ہوئے خود سے سوال کیا......شائد عمل......کیسا عمل......؟؟ میں سوچنے لگا......وہ چاہتا تھا......میں اس کی بنائی گئی قبر میں رہوں۔

سامنے ایک نئی قبر کھودی گئی تھی ......نئی ہونے کے باوجود شکستگی عیاں تھی ......اطراف میں لگائے گئے تہہ در تہہ پتھر ذرہ بھی خوبصورت نہ تھے اُن میں سوراخ دیکھ کر میں تو گھبرا گیا ......میرے اندر اندھیرا پھیلنے لگا ......جسم میں بے چینی سرایت کر گئی ...... میں اُداس ہو گیا ۔ایسے لگا جیسے کلیجہ حلق میں اٹکا ہوا ہو ......اچانک اس نے مجھے پکڑ لیا ...... میں نے اُس سے پوچھا ......تم کیا چاہتے ہو......؟؟؟

اس نے قبر کی طرف انکھیوں سے اشارہ کیا ۔

کیا مجھے یہاں رہنا ہے ......؟؟؟

اُس نے اثبات میں سر ہلایا ۔

نہیں میں یہاں نہیں رہ سکتا ...... میں نے ترش لہجے میں کہا ...... میں تو نرم گداز بستر پہ سونے کا عادی ہوں ......مٹی سے ہمیشہ خود کو بچایا ......میرے گھر مار بل اور خوبصورت نقش و نگار سے مزین ٹائلیں لگی ہیں ......مگر وہ مُصر تھا ...... میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ زبردستی پہ اتر آیا ......وہ مجھ سے بہت طاقتور تھا ...... میں نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی ۔

وہ پھر سے میرے پیچھے بھاگنے لگا ......پھر نجانے کتنی ہی دیر ہم دونوں بھاگتے ہی رہے ......بھاگ بھاگ کر جب میں تھکاوٹ سے نڈھال ہوا تو اُس نے مجھے دبوچ لیا ...... میں تھر تھر کانپ رہا تھا ......جو جہاں تھا ......جیسا تھا ......رک چکا تھا ...... مجھے جان کے لالے پڑ گئے ...... میں نے زور سے چیخ ماری مگر میری کوئی نہیں سن رہا تھا ......اُس کی ایک ہی منشا تھی ...... مجھے یہاں ہر صورت رہنا ہے ......مجھے ایسے لگا میں مر چکا ہوں ۔موت کے احساس نے میری سٹی گم کر دی ......اب میں نے کب زندہ ہونا ہے شاید صدیوں بعد میری قبر کا تو نشان تک مٹ ہو جائے گا ......اُس لمحے میں سسکیاں بھر بھر رونے لگا ...... مجھے خاموش کروانے اور ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا ...... میں نے لوگوں کی طرف دیکھا ......سب تماشائی تھے ...... میں تنہا ......بالکل تنہا تھا ......اتنا تنہا کہ تنہائی بھی دنگ رہ گئی ......سامنے گھنے درخت، خود رو جھاڑیاں اور کانٹے ہی کانٹے تھے ......جن میں موت کی بو پھیلی تھی ۔

میں حیرت زدہ رہ گیا اور تحیّر میں ڈبکیاں کھانے لگا ...... مجھے لگا چاروں اور ویرانی ہی ویرانی تھی ......وقت کا احساس شدت سے دامن گیر تھا ......وہ وقت جو لپ لپ سرکتا تھا ۔آج جامد ہو چکا تھا ...... مجھے کچھ سجھائی نہ دیا تو میں نے زور سے چیخ ماری ......میری چیخ دوسری چیخوں

میں دَب کہ رہ گئی۔
اُس لمحے ہر جانب چیخیں گونج رہی تھیں...... میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا...... احاطے سے قدرے دُور کچھ اور نئی قبریں بھی تھیں......جن میں رہا جا سکتا تھا...... میں نے التجا کی مجھے ان میں سے ایک قبر دی جائے۔
وہاں کھڑا بس مسکرا دیا......اُس کی زیرلب مسکراہٹ میں کئی معنی پوشیدہ تھے...... مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہنے لگا...... آگے کی راہ لو...... یہاں کا کرایہ تمھاری دسترس سے باہر ہے...... مجھے اس بات پر بے حد غصہ آیا...... میں نے اپنی جیب سے بہت سے سکے نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیئے...... سکے دیکھتے ہی بے زاری سے کہنے لگا...... سکے اُٹھاؤ!...... یہ سکے یہاں نہیں چلتے۔
میں نے وہاں کی کرنسی کے متعلق پوچھا......تو اُس نے مجھے سفید چمکتے سکے دکھائے جو میں نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھے تھے۔
یہ سکے کہاں سے اور کیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں؟؟ اُس نے مجھے ساری معلومات دیں تو میں پریشان ہو گیا...... مجھے یقین ہو چلا کہ اب مجھے تماشا بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔
میں وہاں سے قدرے آگے نکلا......وہاں ہر جانب خوشبوئیں پھیلی تھیں۔ خوشبو کا سونگھنا تھا کہ میں خود کو معطر محسوس کرنے لگا......ایک مسحور کن لہر میرے جسم میں پھیل گئی......سامنے بلند مسندوں پہ کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک جانب خوبصورت، سفید، چمکتے چھریرے بدن حرکت کر رہے تھے...... میں نے غور سے دیکھا...... میری حیرت کی انتہا نہ رہی...... وہ تو نرم و نازک، پتلی لمبی عورتیں تھیں۔ ایسی خوبصورت عورتیں میں نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ مستی بھرے انداز میں جھوم رہی تھیں۔ ان کے جسم ایک خاص لے پر حرکت کر رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا وہ کسی شے کے گرد دائرے میں چکر لگا رہی ہیں...... عجیب سرور و مستی میں ان کا لہک لہک کر چلنا...... اُن کی نازک ادائیں...... بڑی بڑی آنکھیں...... عجیب سی کشش رکھتی تھیں...... لانبے لانبے گیسو جو ٹخنوں کو چھو رہے تھے...... زمین کی جگہ پانی تھا جس کے اوپر وہ پھسلی پھسلی جا رہی تھیں...... جی چاہنے لگا میں اُنھیں چھو لوں۔
اچانک کسی نے میری گردن دبوچ لی...... میں نے گردن چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر اُن آہنی ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے نکلنا محال تھا...... میں کچھ دیر زور لگاتا رہا پھر نجانے کب

میری طاقت جواب دے گئی...... میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگا......

وہ مجھے گھسیٹنے لگا...... درد سے میری گردن ٹوٹ رہی تھی ......گردن پہ دباؤ سے آنکھیں پھٹنے کو تھیں......خوف سے میرا جسم کانپنے لگا سخت دباؤ سے سانس لینا مشکل تھا......سامنے مسندوں پہ بیٹھے لوگ میری جانب دیکھنے لگے۔میں چاہتا تھا وہ میری مدد کریں مگر وہ مجھ سے بیزار تھے...... سب میرا تماشا دیکھ رہے تھے...... میں اُن لوگوں میں کوئی شناسا چہرہ ڈھونڈھنے لگا......جو میری اس آہنی گرفت سے خلاصی کراوے...... مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک ڈھیر پہ پھینک دیا گیا......وہاں بے حد تیز بدبو تھی......اِس قدر تعفن کہ سانس لینا محال تھا...... مجھے خود سے گھن آنے لگی......پیٹ میں مروڑا ٹھ رہے تھے......آنتیں بل کھانے لگیں......ایسے لگا سب کا سب منہ سے باہر نکل آئے گا......میری اذیت میں اضافہ ہو رہا تھا......میں نے دیکھا بڑی مسندوں پہ بیٹھنے والوں کا دروازہ بند ہو چکا وہاں ایک بے چہرہ طاقتور جسم کھڑا ہے جسے دیکھ کر میں خوف کھانے لگا اب اس جانب جانا ناممکن تھا......میں سوچوں میں ہی تھا کہ ایک شفاف جسم میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا......میری نظر اس کے پاؤں جانب اٹھی تو آئینے کی طرح شفاف فرش حدنگاہ تک پھیلا تھا......جب کہ غلاظت پہ صرف میں ہی کھڑا تھا......

کس سے ڈر کر بھاگ رہے ہو؟......اُس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

م......مے......میں!!

تم جس سے بھاگ رہے ہو......اُس سے تم نہیں بھاگ سکتے

کیوں......میں نے کریدتے ہوئے پوچھا

اپنے آپ سے بھی بھلا کبھی کوئی بھاگ سکتا ہے......؟؟؟......اس نے پیار بھری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے سفید موتی جیسے دانتوں کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

جب یہ الفاظ میرے کانوں تک پہنچے تو اس کے ہونٹوں کی جنبش سے خوشبو چار سو پھیل چکی تھی۔

اُس کی منت سماجت کرتے ہوئے میں نے راستہ پوچھا......اور اپنے سکے اس کے سامنے رکھ دیئے۔

وہ کچھ سوچنے لگا......میں نے التجا کی کہ وہ میری مدد کرے......اُس نے سپاٹ لہجے

میں کہا......شائد یہ ممکن نہ ہو......

میں رونے لگاتو وہ کہنے لگا...... میں جانتا ہوں ......تم تنہا رہ گئے ہو......مگر کیا تم نہیں جانتے تھے کہ سب تنہا ہوتے ہیں ......اپنا ساتھی تو خود بنانا پڑتا ہے۔

ہاں جانتا تھا پر ...... جواب دینے کے بجائے میری گھگی بندھ گئی۔

اچانک کسی جانب سے شور بلند ہوا......الفاظ حد درجہ کرخت تھے جو سماعت پہ گراں گذر رہے تھے۔

میں نے آوازوں بارے استفسار کیا......تو وہ زیر لب مسکرا دیا ......مسکرانے کی وجہ پوچھی تو بے زاری سے کہنے لگا ......کیا اپنی آواز اور الفاظ بھی نہیں پہچان سکتے ...... مجھے سرانڈ سی محسوس ہوئی اور سانس لینا پھر سے مشکل ہو گیا ......وہ میری حالت بھانپ کر کہنے لگا...... بدبو محسوس کر رہے ہو......؟؟؟...... میں بمشکل ہاں کہہ سکا۔

یہ تمھارے اندر کے غلاظت ہے جو بدبو کی صورت تم محسوس کر رہے ہو۔

میں اس مصیبت سے خلاصی چاہتا تھا۔

وہ کہنے لگا...... پیچھے دیکھو! میں پیچھے مڑا تو وہاں میری صورت کا ایک اور کھڑا تھا۔ پہلے لگا آئینہ ہے جس میں میں خود کو دیکھ رہا ہوں ......مگر وہ میری تصویر تھی ......پھر وہ جسم حرکت کرنے لگا......وہ میں نہ تھا ......میرا دوسرا جسم تھا ......بے وزن جسم ......

اپنے جیسا ایک اور دیکھ کر میں کچھ گھبرا سا گیا ......اگر میں یہ ہوں ......تو وہ کون ہے......؟؟......

اور اگر میں وہ ہوں تو میں کون ہوں ......؟؟

میں ٹپٹا سا گیا۔

یہ کون ہے؟؟ میں نے روشن جسم سے ہکلاتے ہوئے پوچھا......وہ کرخت اور قدرے رعب دار آواز میں کہنے لگا...... ......تم نے صرف ایک نقطے میں ساری زندگی گزاری تھی ......اس نقطے کی زندگی نے آج تمھیں دائرے میں ذلیل ورسوا کر دیا......وہ وقت جس کی پاداش میں آج تم ٹھوکریں کھا رہے ہو......صرف ایک ساعت تھی تم اس ساعت کے امتحان میں پیچھے رہ گئے ہو۔

مگر کیوں؟ میں نے وجہ پوچھی۔

تم نے اُس ساعت میں داغ دھونے تھے اور اُن داغوں کی جگہ روشنی نے لینی تھی۔

اچانک قوس قزح سے کہیں زیادہ دلکش رنگ ایک دوسرے میں ملتے ملاتے عجیب منظر

پیش کرنے لگے......دھیرے دھیرے مختلف رنگ سفیدی میں بدلتے جا رہے تھے ......تھوڑی ہی دیر میں ہر جانب سفیدی پھیل چکی تھی ......میں جس جانب بھی دیکھتا ......آنکھیں چندھیا دینے والی سفید روشنی تھی ......کبھی تو ایسے لگتا کہ ہر جانب آئینے ہیں جو روشنی کو منعکس کر رہے ہیں ......یہ دیکھ کر میرا جسم یخ ہو چکا تھا ......مگر پسینہ پھر بھی آ رہا تھا......سب دیکھ کر بھی سب میرے حواس سے ماوراء تھا......میں اس کے پاؤں پڑنے کو تھا کہ وہ غائب ہو گیا......شاید سامنے تاریکی میں دیوار کی اُس جانب جا چھپا تھا۔

مگر......نہیں ......اُس کا روشن جسم تو سامنے والی تیز روشنی میں مُدغم ہو گیا تھا......میں فضا میں دیکھنے لگا جو تا حدِ نظر پھیلی ہوئی تھی ......میں دائرے میں کھڑا تھا......

یہ دائرہ ایک اور دائرے میں ضم اور وہ دائرہ ایک اور دائرے میں ختم ......ہر دائرے کے بعد ایک اور دائرہ......تا حدِ نظر ......یہ سلسلہ جاری تھا...... سارے تماشائی جا چکے تھے!!!!

کل مونہی

وہ کافی دیر سے خاموش بیٹھا سوچتا رہا
میں اس کے چہرے کا مسلسل جائزہ لے رہا تھا آج اُس کے چہرے کی رنگت کچھ بدلی بدلی سی تھی
قدرے توقف سے میں نے پوچھا
صداقت کیا بات ہے......خیریت تو ہے......آج کچھ خاموش، خاموش سے ہو؟
وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا......اِس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ......
بس رہنے دو......
کیوں کیا ہوا......کچھ بتاؤ تو؟......
وہ بات کرنا چاہتا تھا مگر کہاں سے شروع کرے......اس تذبذب میں مبتلا تھا......کچھ
دیر خاموشی کے بعد پوچھنے لگا
تمہارا عورت کے متعلق کیا خیال ہے؟......عورت کے متعلق خیال ...... میں کچھ سمجھا
نہیں ......
تمھا را عورت کے متعلق کیا نظریہ ہے؟؟؟............میں اِس کے سوال کے پس منظر
پہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے سوال دہرایا دیا
عورت کے بارے میں مختلف نظریات ہیں ......
کوئی کائنات میں بکھرے رنگوں کا بنیادی جز و عورت کو سمجھتا ہے تو کوئی ان رنگوں میں
فساد کی جڑ عورت کو کہتا ہے......
کوئی اُسے پھول کہتا ہے تو کوئی کانٹا......کوئی اُسے پیکرِ حیا بتاتا ہے تو کوئی بے حیائی کا
منبع قرار دیتا ہے......کوئی دِلربا تو کوئی دِل شکن......
جس کو جس طرح کا تجربہ ہوا وہ اُسی انداز میں اس کی تعریف کرتا ہے......میں بات کر
ہی رہا تھا کہ وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا......

عورت صرف مطلب پرستی کا ڈھوکا وہی کا نام ہے...... جب تک اِس پر منوں مٹی نہ پڑ جائے اِس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بے وقوفی ہے......

......ہاہاہا......ایسی بات نہیں ہے......ہاں ! ...... یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہو سکتا ہے......''میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ غصے میں نظر آنے لگا......

دُنیا میں کوئی کسی کا نہیں سب مطلب کے ہیں......اُس نے جھنجلا ہٹ سے کہا۔

آج تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو......خیریت تو ہے......میں نے استفسار کیا۔

یہاں ہر کوئی صرف زخم دینا جانتا ہے کوئی کسی کے زخموں پہ پھاہا نہیں رکھتا......اُس کا لہجہ اُسکے غصے کی غمازی کر رہا تھا۔

نہیں جی !......دُنیا میں اچھے برے سب بستے ہیں اُن لوگوں کی کمی نہیں جو زخموں پہ مرہم لگاتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو زخم اُدھیڑ کر نمک پاشی کرتے ہیں......وہ بھی ہیں جو اپنا فائدہ چھوڑ کر دوسروں کے کام کر جاتے ہیں ایسے بھی بہت ہیں جو صرف اپنے ہی فائدے پہ نثار رہتے ہیں...... بس...... اچھا رویہ اور مثبت سوچ انسان کو انسانی معراج تک پہنچا دیتی ہے......میری بات کاٹتے ہوئے بے ساختہ کہنے لگا......

ہاں ......تمہارا پالا جو نہیں پڑا......جب واسطہ پڑے گا تو لگ پتہ جائے گا......

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بیٹھنے پہ اصرار کیا مگر وہ مضطرب اور بے چین سا تھا......بس ہاتھ ملایا اور چل دیا۔

صداقت جس لڑکی سے محبت کرتا تھا اس کی منگنی ہو رہی تھی اور جلد ہی شادی بھی...... یہ بات اُس کی برداشت سے باہر تھی......وہ لڑکی کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا......وہ ایسا کرنے سے اجتناب برت رہی تھی......صداقت کے گھر والے بھی اس رشتہ پہ راضی نہ تھے۔

وہ نائلہ کو بار بار اپنی محبت، چاہت، خلوص، اور سچائی کا یقین دلا رہا تھا......صداقت کے انہی الفاظ نے اُسے کشش و پیچ میں مبتلا کر رکھا تھا......

اُسے والدین کا اعتبار، بہن کا پیار، بھائی کا وقار ختم ہوتا نظر آتا تو وہ خود کو عجیب سی کشمکش میں گھیرے محسوس کرتی......اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کونسا راستہ اپنائے......نائلہ کی منگنی کے ساتھ ہی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں......خرید و فروخت جاری تھی......کل لڑکے والوں نے

انگوٹھی پہنائی تھی ......اور شادی کا دِن طے ہوتا تھا ......خاندان میں مبارک بادوں کا سلسلہ جاری تھا......صداقت نائلہ کو منانے میں جتا رہا......نائلہ اُسے کہہ رہی تھی کہ جب آپ کے والدین ہی مجھے قبول کرنے کو راضی نہیں تو پھر بتائیں ہم کیسے اور کہاں رہیں گے؟ ؟؟......

صداقت اُسے مختلف دلیلیں دینے کے بعد مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ شادی کے بعد ویسے بھی اکثر لوگ والدین سے الگ رہتے ہیں ہم بھی اپنا الگ سے گھر بنائیں گے......جہاں ہم اپنی نئی زندگی کی شروعات کریں گے سب ٹھیک ہو جائے گا......وہ تذبذب کا شکار تھی......ایک اَن دیکھا خوف اُسے گھیرے ہوئے تھا وہ اُسے سمجھانے لگی کہ شادی کے بعد ہمارے لیئے مسائل بنیں گے اور والدین کی بھی رسوائی ہوگی......کیا والدین کو رسوا کر کے ہم خوش رہ پائیں گے......وہ لجاجت بھرے لہجے میں نائلہ کی منتیں کرنے لگا......نائلہ اُسے بھی پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی......

وقت قریب سے قریب تر ہو رہا تھا......صبح نائلہ نے کسی کی امانت بن جانا تھا......والدین کی خوشی دیدنی تھی......لڑکا کسی پرائیوٹ ادارے میں اچھے عہدے پہ ملازم تھا......نائلہ کی بہن کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا اور بھائی بھی مطمئن تھا والدین خاندان والوں کی مبارک بادیں وصول کر رہے تھے......سامنے والے کمرے میں تحائف رکھے جا رہے تھے......دو لہے کو دوست مبارک بادیں دے رہے تھے اسکی خوشی بھی دیدنی تھی......لڑکے والے کپڑے اور انگوٹھی لے کر نائلہ کے گھر پہنچے مگر اس سے قبل نائلہ گھر کی دہلیز پار کر کے صداقت کے ساتھ جا چکی تھی......

صداقت کے لجاجت بھرے لہجے اور دِل گرفتگی نے نائلہ کو ہتھیار پھینکنے پہ مجبور کیا......یا شاہد جذبات قدم اٹھانے سے پہلے سوچنے سمجھنے کی حس ہی ختم کر دیتے ہیں......

دونوں خاندانوں کے بزرگ، جوان اور بچے اکٹھے تھے جب یہ خبر پہاڑ بن کر اُس کے والدین پر آن گری......

والدہ کے آنسو تھم نہیں رہے تھے وہ روہانسی ہو کر کہنے لگی اتنے لاڈ، پیار سے پالا، پڑھلیا لکھایا، اپنی ضرورتیں ترک کر کے بچوں کی خواہشات پوری کیں اِن کی پڑھائی کی خاطر نا دن دیکھا نا رات، اپنا سکون غارت کیا......آج یہ دن بھی دیکھنا تھا......کیا اِس دن کی خاطر پال پوس کے بڑا کیا......میری بیٹی نے میرے ساتھ کیا کیا......ماں بال نوچ کر بین کئے جا رہی تھی اُسے اپنی بہن دلاسہ دے رہی تھی......وہ مسلسل کہے جا رہی تھی کہ ہماری تو ناک کٹ گئی......کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے......ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بنانے والی کاش پیدا ہوتے ہی مر

جاتی ......کل موہی ......کم بخت ......کم ظرف۔

گھر میں کہرام مچا تھا جیسے صفِ ماتم بچھی ہو...... والد نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا تھا......والدہ پہ سکتہ طاری تھا...... جب ذرہ ہوش میں آتی تو بددعائیں دیتی......

اُس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحتیں مفقود ہو چکی تھیں ......نائلہ کے والدین کے چہروں سے غم اور شرمندگی کی پرچھائیاں اُڑ رہی تھیں ......آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے ......گھر کی آزاد فضا میں گھٹن اور وحشت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

نائلہ صداقت کی بن چکی تھی ......دونوں کہاں تھے کسی کو کوئی علم نہ تھا...... محلے گلی میں چہ می گوئیاں عروج پہ تھیں...... جتنے منہ اُتنی ہی باتیں...... کئی زبان کے چٹخارے تو کئی وقت گزاری کی خاطر اُن کو موضوع بحث بنا لیتے......

والدین کے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب نا تھا...... والد خاموش اور گہری سوچوں میں گم تھا والدہ دن رات بیٹی کو تی......نائلہ کی چھوٹی بہن شمائلہ سہمی ہوئی تھی...... والدین اُس کی جانب دیکھتے تو اُسے ایسے محسوس ہوتا کہ وہ زمین میں گڑی جا رہی ہے...... بھائی اپنے کمرے میں بند تھا۔

نائلہ کی خالہ بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی حالات اچھے ہوں یا برے، وقت کبھی نہیں رُکتا......گہرے سے گہرے زخم بھر ہی جاتے ہیں بس کرو ہر وقت بددعائیں نہ دیا کرو......نا سمجھ تھی ورنہ کب ایسا کرتی ......کل کلاں اُسے کچھ ہو گیا تو خود ہی اِس آگ میں جلو گی۔

نائلہ کو گھر سے نکلے سال سے اُوپر ہونے کو تھا......خبر گردش کر رہی تھی کہ اُس کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی ہے......والدین اس کا نام سننا پسند نہ کرتے تھے۔

شمائلہ کی شادی نائلہ کے منگیتر سے کر دی گئی تھی وہ اپنے گھر خوش تھی اللہ نے چاند سا بیٹا اور بیٹی سے نوازا......شمائلہ والدین سے ہنسی مزاق میں بچپن کی باتیں ......شرارتیں یاد کرتے وقت نائلہ کا ذکر کر ہی جاتی ...... جب اس کا ذکر آتا تو خاموشی سی پھیل جاتی ......کوئی اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا......سات سالوں میں نائلہ کی پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں ......صداقت بیٹے کا خواہش مند تھا...... پہلے دو چار سال تو محبت کی باتیں رہیں پھر پے دَر پے بچیوں کی پیدائش، صداقت سے والدین، بہن بھائیوں کا کئی کترانا، صداقت کا رویہ بھی رفتہ رفتہ نائلہ سے بدلنے لگا......اکثر وہ نائلہ کو طعنہ دیتا......جو اپنے والدین کی نا بن سکی بھلا میری کیا بنے گی۔

نائلہ یہ سنتے ہی فق سی ہو جاتی روز روز کے طعنوں نے اُسے بھسم کر کے رکھ دیا تھا......

گول سفید چہرہ زرد اور پژ مردہ ہو چکا تھا فربہ جسم کمزور اور تھکاوٹ سے چور چور رہنے لگا...... وہ زندگی سے تنگ آ چکی تھی خودکشی بارے سوچتی پھر بچیوں کا خیال آڑے آ جاتا ......نائلہ نے نبھا کی حد کردی ورنہ جہاں روز گالیاں بکی جاتی ہوں زرہ زرہ سی بات پہ تھپڑ رسید کیے جاتے ہوں ......بات پہ بات ذلیل کیا جاتا ہو وہاں نبھا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اُس نے اپنی بچیوں کے اچھے مستقبل کی خاطر گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا...... جب کبھی وہ کسی سہیلی کا تذکرہ کرتی تو صداقت غصے میں آ جاتا ......اور فوراً کہہ دیتا تمھاری سہیلی بھی کیا دیوار پہ باندھ گئی تھی۔

نائلہ اکثر سوچتی کاش وقت واپس لوٹ آئے ......مگر وقت اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا......اب تو صداقت کے تھپڑ اور طعنے روز کا معمول بن چکے تھے......نائلہ صداقت کی باتیں سن کر اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ...... شاید والد کی آہ اور والدہ کی بد دعائیں اس کے تعاقب میں تھیں ......اُسے کہیں بھی چین اور سکون میسر نہ تھا ......وہ لحہ بہ لحہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتی ...... پھر اُسے پتا چلا کہ صداقت نے شادی کر لی اُس شادی میں صداقت کے والدین کی مرضی بھی شامل تھی۔

آج نائلہ تنہا بیٹھی رو رہی تھی۔

نائلہ جب بھی بیٹیوں کیلئے کچھ مانگتی تو اُسے ماسوائے مار کھانے کے کچھ نہ ملتا......کچھ دیر ہنگامہ رہتا گالیوں اور رونے کی آوازیں بلند ہوتیں برتن ٹوٹتے پھر دروازہ زور سے بجتا......ہلکی ہلکی سسکیوں کے بعد اچانک خاموشی سی پھیل جاتی ......وہ اپنے پھپھولے پھوڑنے کے لئے خود کو کوستی، گال پیٹتی ......اس لمحے اس کے چہرے کی کساوٹ سے اُس کے کرب کا اندازہ ہوتا ...... بیٹیاں بھی روز روز کے اس اذیت ناک رویے سے تنگ آ چکی تھیں۔

ماں ......ابو آپ کو روز کیوں مارتے ہیں؟ ......چھوٹی بیٹی نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

ماں نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا ......بیٹی ......میں ......میری قسمت......میرا نصیب الفاظ بن نہیں پا رہے تھے گھگی بندھ گئی اُسے لگا کوئی اندر سے کلیجہ کھرچ رہا ہے پھر ایک دل سوز چیخ ابھری۔

صداقت زیادہ وقت نئی بیوی کے ساتھ گزارنے لگا تھا......

نائلہ جائے تو کہاں جائے ......اپنا دُکھ کس کو سنائے ......اپنے درد کس کو بتائے ...... کہے تو کس سے کہے ......اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

والدین، بہن بھائی اور خاندان والے اُس سے منہ موڑ چکے تھے ...... بیٹیاں جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکی تھیں ...... مگر اُن کا رشتہ مانگنے والا کوئی نہ تھا۔

گھر کے ماحول اور والدہ کے کردار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر خاندانی شخص کترا رہا تھا۔

نائلہ کی بڑی بیٹی صاعقہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگی آپ اپنے گھر والوں کو ہمارے ہاں بھیجیں نا۔

اوہو...... میری جان تم سمجھتی نہیں میں نے امی سے بات کی ہے ...... تو پھر ...... انھوں نے کیا کہا صاعقہ بے قراری سے پوچھنے لگی۔

امی تو غصے ہو رہی تھیں ...... اُسنے سپاٹ لہجے میں کہا ...... پر کیوں؟؟؟ ...... صاعقہ نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

بات یہ ہے کہ امی تمھیں تو پسند کر ہی لیتیں پر؟؟ ...... پر کیا؟؟ ...... صاعقہ نے چلبلاہٹ سے پوچھا۔

صاعقہ دیکھو میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی بھی کرونگا ...... اُس کی آنکھوں میں چمک دکھائی دینے لگی۔

ہاں ...... پر ...... اگر ...... تمھاری والدہ نے رشتہ نا مانگا تو؟ ...... صاعقہ کسی خیال کے زیر اثر سوچنے لگی۔

تو کیا ...... ہم پھر بھی شادی کر لیں گے وہ ڈوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے کہنے لگا۔

کچھ عرصہ بعد وہ صاعقہ کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کرنے لگا تھا ...... وہ کہہ رہی تھی کہ اپنی امی کو ہمارے ہاں بھیجو۔

وہ اُسے اپنی محبت، چاہت، خلوص اور سچائی کا یقین دلانے لگا ...... صاعقہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی ...... اُسے ماں کی محبت، بہنوں کا پیار اور اُن کے مستقبل کی فکر بھی ستانے لگی ...... ماں کی اذیت بھری زندگی کا ایک ایک پل اُس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلنے لگا ...... ماں کی نصیحتیں دامن گیر ہونے لگیں۔

مگر وہ بھی ہر وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے جھلملا رہا تھا ...... اس کے بچھڑ جانے کے خیال سے ہی مردنی سی چھا جاتی۔

اُس کی آنکھوں کی سرخی اور بہتے آنسو ...... محبت کے عہد و پیمان ...... ساتھ جینے، مرنے

کی قسمیں ......نئی زندگی کی شروعات اور خوابوں کی تعبیر وہ بھول نہیں پا رہی تھی اور مضطرب تھی کہ کیا کرے ......ذہنی کشمکش میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا ......جوانی اندھی ہوتی ہے اور جذبات قدم اٹھانے سے پہلے سوچنے سمجھنے کی حس ختم کر دیتے ہیں طے پایا کہ وہ صبح سویرے عدالت میں شادی کر لیں گے ......رات گئے وہ انہی خیالات میں اُلجھی رہی پھر نجانے کس لمحے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صاعقہ کی ماں بد دعائیں دے رہی تھی ......اُس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے وہ روہانسی ہو کر کہنے لگی اتنے لاڈ، پیار سے پالا، جیسے تیسے پڑھایا لکھایا، خود فاقہ کیا اِن کی ضرورتیں پوری کیں اِن کی پڑھائی کی خاطر لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھے، جھاڑو دیئے ......نا دن دیکھا نا رات ......اپنا سکون غارت کیا......خاوند سے مار کھائی ......آج یہ دن بھی دیکھنا تھا......کیا سب اِس دن کی خاطر کیا تھا......یہ میری بیٹی میرے ساتھ کیا کر گئی ہے وہ مسلسل کہے جا رہی تھی کہ میری صرف ناک ہی نہیں کٹی میری بیٹی میری روح بھی بھسم کر گئی ...... کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ......کاش پیدا ہوتے ہی مر جاتی ......

کل موہی ......کم بخت ......کم ظرف!

صاعقہ کی چھوٹی بہنیں سہمی ہوئی سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھیں ......جو آج جیتی جاگتی لاش دکھائی دے رہی تھی۔

صبح سویرے اُسے موبائل پہ ایک میسج ملا۔

سلام ......میں اپنی خوشی کی خاطر اپنے ماں کا اعتبار اور بہنوں کا مستقبل کسی طور داؤ پہ نہیں لگا سکتی......میرا سب کچھ میرے ماں اور بہنیں ہیں اگر آپ کو واقعی مجھ سے محبت ہے تو اپنے والدین کو راضی کریں اور امی کو ہمارے ہاں بھیجیں ورنہ مجھے ہمیشہ کیلئے بھول جائیں میں زندگی کی شروعات ابھاگن کے طور نہیں کرنا چاہتی ...... خدا حافظ

جب اُس نے میسج والے نمبر پہ فون کیا تو آواز سنائی دی......

آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الوقت رابطہ ممکن نہیں برائے مہربانی کچھ دیر بعد رابطہ کریں۔

تعاقب

وہ جو کر گیا ہے لہو جسم و جاں کو
مقید اُسی خواب کے جال میں ہوں

(رقیہ غزل)

زمین جھول رہی تھی ......گھر اس طرح جھوم رہا تھا جیسے کوئی شرابی نشے میں لڑکھڑا رہا ہو......کبھی ایک جانب کبھی دوسری جانب......سامنے کے دریا میں طغیانی آچکی تھی ...... پہاڑ آپس میں معانقہ کرر ہے تھے......اچانک چھت میں شگاف پڑا وہ چلاتے ہوئے اٹھا اور باہر بھاگ نکلا اس نے باہر جاتے ہوئے بہت شور مچایا پیچھے مڑ کے دیکھا تو اُس کا مکان ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا......اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے والدین بیوی ، بچے لقمہ اجل بن چکے تھے......وہ سسکیاں بھر بھر رونے لگا جب اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو ساری کی ساری بستی ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی......زمین میں اب بھی ارتعاش تھا......وہ رُونا چاہتا تھا پر اس پہ سکتا طاری تھا اچانک اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی اور اُس کی آنکھ کھل گئی......اُسکی چیخ سے کمرے میں موجود سارے ہی اُٹھ گئے وہ رُو رہا تھا اُس کی ماں اور پھوپھو نے اُسے دلاسا دیا......ماں نے گلے لگایا تو اس کی ہچکی بندھ گئی......اُس نے ڈراؤنا خواب جو دیکھا تھا پھر جیسے تیسے وہ سو گیا ......صبح اُس کا چہرہ پژمردہ اور آنکھوں میں وَحشت صاف دِکھائی دے رہی تھی ......اُس نے خواب میں کیا دیکھا وہ بتانے سے بھی اجتناب برت رہا تھا......کیونکہ سوچتے ہی اُس پہ خوف طاری ہونے لگتا......

جو اُس نے دیکھا وہ ممکنات میں سے نہ تھا اگر وہ اُپنا خواب مِن وعَن سنا بھی دیتا تو سب اُس پہ ہنستے اور کوئی بھی اس کے خواب پہ یقین نہ کرتا ......کہاں وہ جماعت نہم کا طالب علم ......کہاں اُس کے بیوی بچے ،مگر ایک اَن دیکھا خوف اُسے ستانے لگا جب اُسے خیال آتا تو وہ دانستہ اپنی توجہ دُوسری جانب مبذول کر لیتا......وہ ایف اے کے امتحانات سے فارغ چھٹیوں کے

مزے لے رہا تھا اور ابھی نتائج میں دو ماہ رہتے تھے تو اس نے اُسی طرح کا ایک خواب پھر دیکھا اس خواب نے اُس کی شخصیت کو بے حد متاثر کیا.....مگر اس رات اس کے کمرے میں ماسوائے اس کے کوئی بھی نہ تھا......

یہ کمرہ اُس نے اپنے لیے یہ سمجھ کر منتخب کیا تھا کہ دوستوں کے آنے جانے میں دِقت بھی نہ ہو اور وہ انہماک سے پڑھ بھی سکے......اس نے کمرے کی تزئین اور آرائش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی سامنے کتابوں کی الماری کے ساتھ مختلف بناوٹی پھولوں سے مزین ایک خوب صورت ٹوکری،ٹوکری سے قدرے پیچھے اس کی بڑی تصویر جسمیں وہ ایک تقریری مقابلے میں دوئم پوزیشن لینے پر انعام وصول کرتا دکھائی دے رہا تھا......ایک جانب پلنگ کچھ فاصلے پر صوفہ اور اسکے سامنے شیشے کی میز تھوڑے فاصلے پہ شیشے کی بڑی الماری اور اس میں ضروریات کی چند چیزیں ایک طرف کھڑکی اس پہ خوبصورت نقش ونگار سے آراستہ پردے پھر دروازہ جو سامنے کے وسیع قطعہ زمین کی جانب کھلتا تھا......وہ روز کوئی نہ کوئی خواب دیکھتا پہلے پہل وہ گھر والوں کو خواب کی بابت کچھنا کچھ تزکرہ کر دیتا پر اب وہ خود ہی اجتناب برتنے لگا......وہ خود سے اکثر ہم کلام ہوتا کہ وہ کسی کو کیا کہے۔

اِس طرح کے خواب پہ بھلا کان کون دھرے گا......کچھ عرصہ سے اس کے خوابوں میں بھی عجیب سے منظر ہوتے کبھی سایہ نما جسم اُس کے ساتھ ہاتھا پائی کرتا تو کبھی اس کا پلنگ ہوا میں ہچکولے کھا رہا ہوتا اب اس کی ان بے تکی باتوں پہ بھلا کون ذی فہم یقین کرتا ......وہ اپنے جس دوست سے بھی خواب کی بابت بات کرتا تو وہ اِسے واہمہ قرار دیتا ......کوئی اس کی بات ماننے کو تیار نہ تھا......پھر سب سے حیران کُن بات جو وہ خواب میں دیکھ رہا تھا عملی زندگی میں ان خوابوں کا کوئی جوڑ نہ بنتا تھا......والدین کو خواب سناتا تو وہ رات دائیں کروٹ سونے کی نصیحت کرتے ......دوستوں سے بات کرتا تو وہ ہنس کے ٹال دیتے تھے......وقت گزرتا گیا پھر ایک رات جب اس نے دیکھا اس کے شہر کے سارے پلازے،عمارتیں، مکان گر رہے تھے سامنے کے پہاڑ آپس میں ملے جا رہے تھے اُسے ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دینے لگا......اس کے گھر سے قدرے دُور دَریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی زمین اسکا نام پکارتے ہوئے کہہ رہی تھی......

سنو ......سب کو بتا دو......مجھ سے اتنا بوجھ اب نہیں اٹھایا جاتا میں سب باہر نکالنا چاہتی ہوں......جب میں سب باہر نکالوں گی تو سب تہس نہس ہو جائیں گے میرے پھٹتے ہی ساری

سڑکیں، عمارتیں، راستے، پل، پلازے، مکان ریزہ ریزہ ہو جائیں گے...... پھر پہاڑ اُس کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ میں ایک جگہ کھڑے کھڑے تھک چکا ہوں میں اب قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔
سامنے بہتا دریا ساتھ والی پہاڑی سے محو گفتگو تھا...... وہ کہہ رہا تھا کہ میں تم پہ آ کر سارا نظارہ کرنا چاہتا ہوں وہ بار بار پہاڑی کو پکارے جا رہا تھا وہ آگے سے خاموش سن رہی تھی ......
وہ قدرے غصے میں کہنے لگا کہ میں پست نہیں آج اگر نیچے ہوں تو کل اُوپر بھی آ جاؤں گا ...... اُس کی آنکھ کھلی تو وہ کانپ رہا تھا جسم میں سردی لہر کوند رہی تھی ...... زمین اور پہاڑ نے اُس سے باتیں کیں ...... دریا اور پہاڑی کی باتیں اُس نے سنیں۔
صبح اس نے اپنے انتہائی قریبی دوست سے ہچکچاتے ہوئے کہا ...... طاہر میں نے رات کو خواب دیکھا ہے۔
اچھا تو کیا پھر ڈر گئے تھے......؟؟ طاہر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا......
ہاں مگر ...... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ طاہر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا......
یار یہ ڈراونی فلمیں دیکھنی چھوڑو...... تم ہارر فلمیں بھی تو بہت دیکھتے ہو...... طاہر نے اُس کی پسندیدہ فلموں کے نام گننے شروع کر دیئے......
ہاں تم ٹھیک کہتے ہو پر......؟؟؟
بس انہی فلموں کا سب کیا دھرا ہے دن کے خیالات رات کو صورت بن کے تمھارے خواب بن جاتے ہیں...... طاہر نے بے توجہی سے کہا......
میری بات تو سنو...... اُس نے زور دیتے ہوئے کہا...... وہ طاہر کی توجہ کا طالب تھا مگر طاہر اُس کے کئی خواب پہلے بھی سن چکا تھا...... اُسے ان خوابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب اُس نے اصرار کیا تو طاہر اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا...... اچھا آج تو میں سن لیتا ہوں پر خدارا...... آج کے بعد مجھے اِس طرح کے خواب نہ سنانا ...... اس کے چہرے سے بیزاری عیاں تھی...... وہ طاہر کے اِس رویے سے مایوس ہو کر خاموش ہو گیا۔
جب طاہر نے محسوس کیا کہ وہ ناراض ہو رہا ہے تو اُس نے اصرار کرنا شروع کر دیا اچھا پلیز اب خفا نہ ہو سناؤ کیا دیکھا...... مگر وہ بغیر خواب سنائے چل دیا۔ طاہر اُسے منانے لگا تو وہ روہانسی آواز میں کہنے لگا میں کس سے بات کروں میرے دل کا بوجھ کیسے ہلکا ہو...... میں بہت تھک چکا ہوں۔

طاہر نے اُسے دل سے لگاتے ہوئے کہا مجھ سے بات کرو میں سنوگا ......مجھ سے غلطی ہوگئی اب پلیز موڈ ٹھیک کرو......اچھا بتاؤ کیا دِیکھا......؟؟

وہ زمین اور پہاڑ نے مجھ سے باتیں کیں ہیں......

طاہر کو ہنسی آنے کو تھی جسے اس نے دانستہ روکا کی کہیں پھر نا راض نہ ہو جائے......اچھا کیا باتیں کیں وہ اپنے الفاظ میں شعوری حیرانگی اور چہرے کے خط وخال کو دانستہ بدلتے ہوئے کہنے لگا......طاہر زمین تھک چکی ہے اور پہاڑ قدم اٹھانا چاہتا ہے......اُس کی آنکھوں سے وَحشت ٹپکنے لگی تھی......پھر وہ رُونا شروع ہوگیا......

میرے والدین بیوی بچے سب لوگ میری آنکھوں کے سامنے مر رہے تھے اور میں بے بسی سے سب دیکھ رہا تھا کچھ بھی تو نہیں کر پا رہا تھا......طاہر نے اُسے دلاسہ دیا اور آہندہ کلمہ،آیات الکرسی اور قُل پڑھکر سونے کی تاکید کی......

کبھی کبھار اُسے کوئی سایہ نما جسم چلتا دکھائی دیتا وہ سہم سا جاتا جب کہ وہاں کوئی نہ ہوتا......وہ واش بیسن کے سامنے منہ دھو رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر سامنے شیشے پہ جا ٹکی......اس کے پیچھے......اُسکے جیسا......ایک اور کھڑا......اُسے دیکھ کر ہنس رہا تھا......نظر کا ملنا تھا کہ اس کی سِٹی گم ہو گئی......وہ سر پٹ چھت کی جانب بھاگ کھڑا ہوا چھت پر پہنچ کر اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا......اُس کے پسینے میں شرابور جسم سے اس کی قمیض بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گئی تھی......وہ چھت پر کھڑے سوچنے لگا کہ وہ کیوں بھاگا تھا وہ سامنے واش بیسن اور دیوار کے ساتھ لگے آئینے کو دیکھنے لگا وہاں تو کوئی بھی نہ تھا......

اُسے خود پہ غصہ آنے لگا......وہ کیوں کر اس طرح سے محسوس کرتا ہے......جب کہ سب وہم ہے......خود کو تسلی دیتے ہوئے اپنے جسم کو ٹٹولنے لگا اس کے دِل کی دھڑکن بے حد تیز تھی اور اضطراب اُسے گھیرے ہوئے تھا......مگر خود کو تسلیاں بھی دیئے جا رہا تھا......اُن دِنوں کئی خواب ایسے ہوتے جو من وعن ایک دو دن بعد ظہور پذیر ہو جاتے۔

جب واقعہ ہوتا تو وہ خود سے سوال کرتا......کیا ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہے......پھر خود کو جواب دیتا نہیں نہیں......ایسا پہلے نہیں ہوا یہ واقعہ تو پہلی بار آج ہی ہوا تو پھر میں نے ایسا واقعہ پہلے کب دیکھا تھا......وہ عجیب واقعات میں پھنسا ہوا تھا......

اُس نے نامور معالجوں سے معاینے کروائے......سب اُسے گہری نیند اور ذہنی سکون

کی ادویات ہی دیتے ......کئی سال ادویات کا استعمال کرتا رہا......دام درود بھی ہوئے ......فال بھی نکلوائے ......کئی عامل اُس کی بیماری کا روحانی علاج بھی کرتے رہے......اکثر تعویز دیتے، کئی علماء اُسے کہتے کہ قرآن کی تلاوت زیادہ سے زیادہ کیا کرو......بعض نے مخصوص تسبیحات بھی پڑھنے کو کہا......آیات کا ورد کرنے سے اُس کا جسم اب ہلکا پن محسوس کر رہا تھا......درمیانی عرصہ میں اُس کی پھپھیاں اپنے گھروں کی ہوئیں......اب تو ان کی بچیاں، بچے سکول میں پڑھ رہے تھے......وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا......آج اُس کی شادی تھی گھر میں خوشیاں تھیں......والدین کی خوشی دیدنی تھی......بہن بھائی، رشتہ دار، محلّہ دار خوب ہلا گلا مچا رہے تھے......شادی کے بعد اس کی مصروفیات بھی بدل چکی تھیں مگر پھر بھی کبھی کبھار وہ ماضی کے بارے میں سوچتا تو تھرا اُٹھتا اور ایک سرد سی لہر اس کے وجود میں تھرتھری سی مچا دیتی......وہ سب بھول جانا چاہتا تھا وہ ان واقعات کو نہیں دُھرانا چاہتا تھا جو اُس نے ماضی میں خواب کی صورت دیکھے تھے......خوابوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔

اب وہ اُنھیں کبھی خواب اور کبھی جاگتے کے خیال کہنے لگا تھا......پنتالیس سال بیت گئے آج جب وہ ناشتے سے فارغ ہوتو بیوی نے کہا آپ کسی دن چھٹی کریں ہم اکھٹے گھومنے جائیں......چند دنوں بعد اُس نے چھٹی لے لی۔

وہ واش بیسن کے سامنے کھڑا آئینے میں خود کو دیکھنے لگا کئی دنوں بعد آج اُس کی خود سے ملاقات ہوئی، خود سے ملاقات اور آنکھوں آنکھوں میں باتیں ورنہ تو جلدی جلدی ہی سب کام نمٹانے ہوتے ہیں......وہ ٹیک لگائے خود کو دیکھتے ہوئے زیر لب کہنے لگا واقعی چھٹی بھی کرنی چاہئے ایک ہی ماحول میں رہتے رہتے اُکتا ہٹ سی ہو جاتی ہے۔

سامنے ایک طرف اُسکی پرانی تصویریں بکھری ہوئی تھیں......جو اُس کی بیوی اور بیٹی نے کچھ سے پہلے دیکھکر رکھی تھیں۔

وہ ایک تصویر اٹھائے اپنا جائزہ لینے لگا" وہ وہی تھا جو کہ وہ تھا......" مگر نہیں۔

وہ تصویر کی نسبت کافی صحت مند تھا......پہلے کہ جیسی کمزوری رفو ہو چکی تھی اُس کا پیلا رنگ اور آنکھوں کے گرد پھیلے حلقے ختم ہو چکے تھے......

مہینوں بعد آج پورا دن اُسے اپنے چھوٹے سے گھرانے کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا تھا......ورنہ جب وہ اُٹھتا تو بیوی ناشتہ تیار کر کے ڈیوٹی پر اور بچی اسکول کو جا چکی ہوتی اور جب وہ لوٹتا تو وہ دونوں نیند کے مزے لے رہیں ہوتیں......وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے آج اُس کی

شادی کی دسویں سالگرہ تھی۔طے یہ پایا تھا کہ سالگرہ کے دن وہ جی بھر کے گھومیں گے اور موبائل بند رکھے جائیں گے......

وہ صبح سویرے اٹھے، اکھٹے ناشتہ کیا، جویریہ اُن کی بیٹی نہا چکی تھی اور نئے فراک میں بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی وہ اپنے نرم، ریشمی بالوں کو سلیقے سے سنوار کے تیار کھڑی تھی...... اُس کی معصومیت اور خوشی دیدنی تھی......اُس نے بغیر ستائے ناشتہ بھی کر لیا تھا......پھر وہ خود نہانے کے لیے واش روم کی جانب چل دیا......اُس کی بیوی جانتی تھی کہ اب وہ دیر سے ہی برآمد ہو گا مگر آج اُس نے عادت کے برخلاف جلد ہی نہا کے نئے کپڑے زیب تن کر لیے تھے......گاڑی آ چکی تھی ڈرائیور بار بار موبائل پہ گھنٹیاں دے رہا تھا وہ بیوی سے کہنے لگا"شام تک گھر واپسی ممکن بنائی جائے اگلے دن ڈیوٹی پہ بھی تو جانا ہے" ......ٹھیک ہے۔

بیوی نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سامنے ٹیبل پر سے پرس اٹھایا اور سامنے پڑے چار ہارٹ پارٹ اُس کے ہاتھوں میں تھما دیئے......وہ انہیں اُوپر نیچے رکھ کر ایک کپڑے میں باندھنے لگا......تیاری مکمل ہوتے ہی ان کی گاڑی شہر سے نکل رہی تھی......ایک گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد وہ باغ کی سیڑھیوں کے پاس جا اُترے...... جب وہ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ باغ کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھ رہا تھا تو اُس کی بچی کی خوشی کی کوئی حد نہ تھا۔

باغ میں داخل ہوتے ہی اُس کی بیٹی جھولے کی جانب بھاگ پڑی......دونوں نے باآواز بلند کہا آہستہ آہستہ!گر جاؤ گی مگر وہ جھولے کے پاس پہنچ کے ہی ٹھہری......اُس نے جھولے لینے شروع کر دیئے......وہ باغ کے عقبی جانب موجود ہوٹل سے مشروب لینے چل دیا......خوب گھومنے کے بعد باغ کے ایک کونے میں سب نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا......گھر سے لائے گئے کھانے میں سے ہی ڈرائیور کو بھی کھانا پہنچایا گیا......ڈرائیور بھی تو باغ میں سیر کے مزے لے رہا تھا پھر طے پروگرام کے مطابق وہ مسجد جا پہنچے جہاں نماز کی ادائیگی کی گئی اور اس مسجد کو چاروں جانب سے گھوم پھر کے دیکھا گیا بچی مسجد کی بابت سوالات بھی کیے جا رہی تھی جس کے جواب کبھی وہ خود تو کبھی شریکِ حیات دیتی......پھر وہاں سے وہ جھیل کے کنارے پہنچے،سامنے کشتیاں تیر رہی تھیں بچی نے ضد کی کہ اُسے بھی کشتی میں بٹھایا جائے مگر وہ نہ مانا......حالانکہ بیوی نے کہا بھی تھا کہ لے جائیں بار بار جو کہہ رہی ہے مگر اس کے دل میں اَن دیکھا خوف دَر آیا کہ کہیں وہ ڈوب ہی نہ جائیں۔

آپ تو خوامخواہ ہی ڈر جاتے ہیں بیوی کشتی میں بٹھانے پہ بضد تھی......میں ڈرتا نہیں ہوں

بس کسی بھی کشتی میں نہیں بیٹھیں گے ...... پھر کافی دیر خاموشی رہی۔

بچی اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر منہ بسورے ایک جانب بیٹھ گئی اس وقت کتنے ہی غور سے اُس نے بچی کے منہ کو دیکھا اور کافی دیر تک اپنی نظریں اُس کے چہرے پہ گاڑھی رکھیں وہ خفا ہو کر بھی بہت خوبصورت دِکھتی تھی۔ میری بچی، میری پیاری بیٹی میرے پاس آجائے۔ وہ خفا ہونے کے باوجود والد کی آغوش میں آگئی۔ رات گئے واپسی ہوئی۔ کچھ ماہ بعد اسے اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ والدین حج کی سعادت حاصل کر کے واپس لوٹے۔ وہ خود کو خوش قسمت سمجھنے لگا جس نے والدین کی خواہش پوری کر کے دعائیں سمیٹی۔ رمضان کی آمد آمد تھی بیوی نے ایک لمبی لسٹ تھماتے ہوئے کہا کہ یہ سودا سلف آپ آج ہی لے آیئے گا۔ سامنے سرسبز و شاداب پہاڑ، ہرے بھرے کھیت اپنی وسعت اور دلاویزی سے کئی سیاحوں کو متاثر کر رہے تھے۔ اخروٹ، بادام، سیب، خوبانی، کے درختوں نے ساری زمین کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ایک جانب خوبصورت رہائشی مکان دوسری جانب سرکاری ریسٹ ہاؤس اپنی مثال آپ تھے۔ کئی دوسرے علاقوں کے لوگ آج کل یہاں ڈھیرے لگائے ہوئے تھے۔ سرد رات میں مسجد سے اُبھرتی صدا نے سب کو میٹھی نیند سے جلدی بیدار کر دیا۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کئی سحری کر کے نماز کی با جماعت سعادت کیلئے تیاری کرنے لگے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد بعض مسجد میں تلاوت کلام پاک اور کئی ذکر اذکار میں محو ہو گئے کچھ اپنے گھروں کو لوٹ کر پھر سے نیند کے مزے لینے لگے۔ وہ چھٹی پہ تھا دو روزے رکھنے کے بعد آج کا دن آرام سے گھر پہ ہی گزارنے کا پروگرام تھا موسم بھی قدرے سرد تھا ہفتے کی چھٹی کے ساتھ اتوار کا دن بھی میسر تھا۔ وہ کافی مطمئن دکھ رہا تھا مسلسل مصروفیت کے بعد دو چھٹیوں کا مزا۔

وہ آکر سو گیا۔ گھنٹہ دو سونے کے بعد اُسے ماتھے پر لمس سا محسوس ہوا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ بیوی اُس کے چہرے پر نظریں گاڑھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

اس کی نظر نادانستہ چہرے سے ہٹ کر سامنے گھڑی پہ جا ٹکی ساڑھے سات بج رہے تھے۔

پہلے تو ملال ہوا پھر بیوی کی آنکھوں میں نجانے کیا دکھائی دیا کہ وہ چپ سا ہو گیا۔

کیوں کیا بات ہے؟؟ اس نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرا دِل سحری سے بے حد پریشان ہے کافی دیر تک آپ کو دیکھتی رہی کہ شائد آپ خود ہی اُٹھ جائیں ...... آپ گہری نیند میں تھے اُٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔

خیریت؟؟ دِل کیوں پریشان ہے وہ اس کا ہاتھ تھام کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ

سمجھ نہیں آ رہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرا دل کھکھور رہا ہے اندر ہی اندر عجیب سی اُلجھن محسوس کر رہی ہوں۔اُس کے لہجے سے عاجزی اور آنکھوں میں آنسو عیاں تھے۔

کیوں کیا ہوا؟؟؟ سوال کرتے ہوئے اس نے دیکھا واقعی اس کے چہرے پہ اداسی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے وہ اُسے کریدتے ہوئے اداسی کی وجہ پوچھنے لگا۔

نجانے کیوں میں کچھ نام نہیں دے پا رہی۔آج مجھے اپنی ماں بے حد یاد آ رہی ہیں ان کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے جھلملا رہا ہے ہم جن کی وجہ سے اِس دنیا میں آئے۔جنھوں نے ہم کو پالا پوسا، بڑا کیا، قدم قدم پہ رہنمائی کی۔کیا ہم اُن کو بھول نہیں گئے، وہ کسی سوچ کے زیر اثر کھلبلاہٹ کا شکار تھی۔

اوہ......اچھا......تب تم اتنی اُداس ہو مگر مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر تو نہیں جایا کرتا......وہ تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

ہاں......آپ ٹھیک کہتے ہیں پر ہمیں اپنے پیاروں کی میتوں کا پیچھا کرنا چاہیے اُن کو یاد رکھنا چاہیے ان کیلئے دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اتنا تو ہم آسانی سے ہر وقت کر سکتے ہیں۔

تم ٹھیک کہتی ہو پر ہم کب اُن کو بھولے ہیں ان کیلئے دعا کرتے ہیں۔آج افطاری کے وقت ہم اُن کیلئے خصوصی دُعا کا اہتمام کریں گے اور ساتھ والی مساجد میں افطاری بھی بھیج دیں گے۔اب اُٹھو اور اپنا موڈ ٹھیک کرو سحری کے وقت تو تم بالکل ٹھیک تھی۔گھنٹہ بھر دونوں باتیں کرتے رہے۔

جب اُسے لگا کہ اب وہ قدرے سکون پہ ہے تو وہ اٹھا اور منہ دھونے چل دیا۔

اچانک زمین تیزی سے جھولنے لگی۔دیکھتے ہی دیکھتے چھت میں شگاف پڑنے لگے۔ چاہتے نہ چاہتے، وہ باہر کو بھاگ نکلا۔

اُس نے باہر جاتے ہوئے بہت شور مچایا......لمحہ بعد پیچھے مڑ کے جو دیکھا تو اُس کا مکان نیست و نابود ہو چکا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے والدین، بیوی، بچے، منوں ملبے تلے دب کے رہ گئے تھے۔مکان خس و خاشاک کی مانند اس کے سامنے بکھرا ہوا تھا۔اُسے کچھ سجائی نہیں دے رہا تھا کچھ لمحوں کیلئے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ساری بستی ملیا میٹ ہو چکی تھی۔کوئی گھر سلامت نہیں تھا زمین میں اب بھی ارتعاش تھا۔وہ سسکیاں بھر بھر رونے لگا اُس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔برسوں سے تعاقب کرتا خواب اُسکی نظروں کے سامنے حقیقت پا چکا

تھا۔ آٹھ اکاون کا ہنستا بستا گھر۔ آٹھ باون پہ ارمانوں کا ڈھیر بن چکا تھا۔

زمین سکڑ رہی ہے

میں پہاڑی پہ بیٹھا ہوں......نہیں کسی جنگل میں گھوم رہا ہوں......نہیں کسی دریا میں ڈبکیاں کھا رہا ہوں۔

نہیں شاید کسی میدان میں کھڑا ہوں......نہیں صحرا میں ریت کھنگال رہا ہوں......نہیں کسی بستی میں محض ایک تماش بین کی طرح محظوظ ہو رہا ہوں۔

نہیں نہیں......کہیں میں بھی ہوں......مگر کہاں......؟؟ مجھے معلوم نہیں۔

میرے ہونے نہ ہونے سے بھلا فرق ہی کیا پڑتا ہے......یہاں تو......؟؟؟ وہ خود کلامی کرتے ہوئے چونک سا گیا۔

ماضی کی بعض یادیں کتنی تلخ اور بعض کتنی شریں ہوتی ہیں۔

قلم کی حرمت ہوتی ہے اور لفظ خداوند کی امانت ہوتے ہیں میں اِن سے کسی طور روح گردانی نہیں کرسکتا......جو تو میں قلم اور لفظ کی حرمت کا احساس ختم کردیں وہ کسی بھی حرمت کا خیال نہیں رکھ سکتیں......وہ بے محابہ کہہ رہا تھا۔

بس بس ہمارے سامنے تقریر نا جھاڑو......کیا تم اپنے سے پہلے والوں کے انجام سے نا بلد ہو۔

جی نہیں میں جانتا ہوں......اُس نے قدرے اطمینان سے جواب دیا۔

تو پھر کیوں فنا ہونا چاہتے ہو......چھوڑ دو قلم اور مت پھیلاؤ سیاہی سامنے کھڑے نے ترش لہجے میں کہا۔

کیا حقیقت کا بیان کرنا جرم ہے......اُس نے بے دھڑک سوال داغا۔

بات کا بتنگڑ نہ بناؤ......دُوسری جانب کھڑا قدرے غصہ میں کہنے لگا۔

آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟؟......اُس نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

خاموشی ...... مکمل خاموشی ...... ایسا ممکن نہیں اس نے دو ٹوک جواب دیا۔
تم دانشور رہو مگر حالات کی نزاکت سے یکسر عاری تمھارا انجام بہت بھیانک ہوگا۔
او ...... تو تم مجھے دھمکی دے رہے ہو ...... جو جی میں آئے سمجھو وہ اُٹھ کے چل دیے۔
وہ سوچنے لگا ...... آخر ایسا کیوں ہے؟؟
کیا ہم اپنی رائے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے؟؟
کیا اب بھی لفظوں پہ پہرے لگے ہوئے ہیں؟؟
کیا کوئی اپنی سوچ کے مطابق عمل نہیں کر سکتا؟؟
کیا سچ کہنا اب بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا پہلے تھا؟؟
اُسے طاقت کے نشے میں بدمست لوگوں کی سوچ پہ ابکائیاں آنے لگیں بہت کچھ سمیٹنے کے باوجود یہ کتنے چھوٹے ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔

مگر ...... وہ ......؟؟؟؟ وہ تو بے حد وفا دار تھا ...... اپنوں سے بڑھ کر اپنا ...... بے زبان ...... سر جھکا کر کام کرنے والا ...... دل سے خیال رکھنے والا ...... بغیر کچھ بتائے کچھ کہے ...... یوں اچانک چھوڑ کر چل دیا ...... کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایسا کرے گا ...... یہ کیسے ممکن ہوا وہ تو اِس گھر کا حصہ تھا ...... اُسے ہمہ وقت گھر میں دیکھ کر دل کو ایک ڈھارس سی رہتی تھی کہ میں تنہا نہیں ہوں ...... تنہائی کا عذاب سب سے بڑا عذاب ہوتا ہے ...... ایسی بے وفائی، بیچ منجدھار چھوڑ کر چل دینا ...... کیا اُس کے بغیر میں بے بس اور لاچار ہوں ......

شاہد ہاں ...... پر نہیں ...... میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہوں ...... میں کمزور نہیں ...... میری روح میرے جسم اور میرا دل میرے دماغ کا ساتھی ہے ...... میں کسی سے بھی مدد نہیں مانگوں گا ...... مجھے کسی کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ...... وہ بڑبڑائے جا رہا تھا ......

پھر ...... پھر یہ وہم میرے اندر کیوں دوڑ رہا ہے کہ اگر مجھے کسی کی ضرورت پڑی تو کس سے کہوں گا ...... کون کرے گا میری مدد؟؟؟ وہ خود کلامی کرنے لگا ......

اذیت ناک لمحات میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا ...... حالات کا سامنا صرف خود کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ کسی خیال کے آتے ہی زیرِ لب مسکرانے لگا۔

ہاں ...... نامرادی انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے اِس کے سائے میں پروان چڑھنے والے کمزور لوگ ہوتے ہیں جو کسی بھی بات پر جم نہیں پاتے ...... دھوپ میں پڑی برف کی مانند لمحہ لمحہ، قطرہ قطرہ بنتے ختم ہو جاتے ہیں ...... یہ کسی کے وفادار نہیں ہوتے انھیں کسی سے کوئی

سروکار نہیں ہوتا اِن کی باتیں اِن کی شخصیت کی طرح کھوکھلی ہوتی ہیں ......ہاتھوں ہاتھ بک جائیں تو ٹھیک ورنہ ختم......ہاں ......انسان کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے وہ بھی منڈی میں اشیاء کی طرح فروخت ہوتا ہے شائد اُس نے اپنی قیمت وصول کر لی ہو گی ......اس کے چہرے پر آزردگی چھا چکی تھی ......

مگر وہ ......؟؟ پر شائد ......؟؟ ہاں ہو سکتا ہے ......چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا ......

وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کسی واقعے کو سوچنے لگا ......اُس کے سامنے بلند فصیلوں کا قلعہ گھومنے لگا باہر فوج کھڑی تھی ......سلطان کے سکے کھوٹے تھے جن پہ تکیہ تھا وہ غدار نکلے اپنے ہی گھر کو بھسم کرنے کے بعد خوشیاں منائی گئیں اُسے بساوٹ کی بجائے بساند آنے لگی ......وہ مغموم سا ہو گیا۔

تم کیوں پریشان ہو کسی خیال نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

میں پریشان نہیں ہوں ......اُس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں اور تمھارا چہرہ بھی بہت کچھ بتا رہا ہے ......میں ایک عرصہ سے تم کو جانتی ہوں ......اُسے سرگوشی سنائی دی۔

ہاں ......میں انسان ہوں حالات مجھ پہ بھی اثرات مرتب کرتے ہیں ......اُس نے بے جھجکی سے کہا ......اگر تم اتنی چھوٹی سی بات سے ہمت ہار گئے تو ؟؟

نہیں نہیں ......ایسی بات نہیں اب کے اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اُس کے خیالات میں بیتے لمحات تسلسل کے ساتھ گھومنے لگے۔

کبھی کون سی بات تو کبھی کون سا واقعہ اس کی نظروں کے سامنے دَر آتا۔

وہ اُس پہاڑ کا سوچنے لگا جس پر کھڑا سب سے اپنے کردار بارے پوچھ رہا تھا اور سب یک زبان اُس کے کردار کی عظمت کو سلام کر رہے تھے مگر اُس کی بات ماننے سے انکاری تھے ......اُسے باز گشت سنائی دی کوئی جنگلی جانوروں سے مخاطب ہو رہا تھا ...... اُسے وہ بھی یاد آنے لگا جو صحرا میں اپنے گھوڑے پہ خاک چھانتا ہوا آگے بڑھے جا رہا تھا۔

پھر اُس کے تصور میں وہ آ گیا جس نے گھوڑے کے سم سمندر میں ڈال کر آواز لگائی تھی ۔اُس نے دیکھا کہ کوئی کشتیاں جلا کر زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کو بیتاب تھا۔وہ خیالات میں ہچکولے کھاتا اُس جوان سے بھی جا ملا جس نے کم عمری میں سارا علاقہ فتح کر لیا تھا۔پھر خیالوں میں اُس نے ڈیرا ڈال لیا جو کہہ رہا تھا۔اِس میں اول تا آخر سب کچھ موجود ہے۔تم اُوندھے منہ نہ گرو۔سنو، پڑھو، سوچو، سمجھو، جائزہ لو، پرکھو، یقین تک جاؤ، تصورات کو واضح کرو۔فکر اور تدبر سے

کام لو۔حقیقت کا پیچھا کرو۔دلیل مانگو۔خود جوبات کرو دلیل سے کرو۔بصیرت اور بصارت کو بروئے کار لاؤ۔جانو۔پہچانو...... پھر ماننے میں لیت ولعل سے ہرگز کام نہ لو۔اُسے نئی سوچ متعارف کروانے والا کہا گیا جو بزرگوں کے طور طریقوں سے یکسر مختلف تھی۔مسالک کی لڑائی نئی سوچ کو کچلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ملاں!ملاں!اورملاں ...... ہر طرف چھا چکے تھے......پھر اُنکے اُکسانے پر اہل ایمان میدانِ عمل میں کود پڑے......کیونکہ اسلام کو سخت خطرہ جولاحق ہو چکا تھا۔

صدیقا قصائی ،مودا نائی، شیدا حلوائی، جیلا چمار، کوبا کمہار،خالد ستار،میدو چڑی،خیرا پالشی،سیدو مالشی،پپا مچھل تیشے والا،پپو درزی،فیقا پلمبر،دیلا دھوبی،مالا ریوڑیاں والا،سائیاں ریڑھی والا،کاکا مزدور،بوٹا رنگساز،پیچو چونے والا، جوتی کپڑے والا،شادا ڈرائیور،ماجا پہلوان،نوشی پھیری والا،مندر علی سٹور کیپر،کالا کباب والا،زیڑا فراڈیا،پیپو پان والا،گلا سبزی فروش،گوشی بجلی والا،نورا چی والا......لبیک لبیک ،زندہ باد،مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے بڑے چوک میں جمع ہو گئے۔ہر ایک اپنی منطق،اپنی سوچ اوراپنا فتوی لئے ہوئے تھا۔وہ تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ حکمت اور علم جہاں سے ملے،جس سے ملے،لے لو۔اُسکی اِن باتوں کو اسلام میں نقب لگانے سے تعبیر کیا گیا۔وہ سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ علم تمھاری کھوئی میراث ہے۔تحقیق اور جستجو تمھارا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہئے۔یہ جو ڈھکوسلے اذہان کو آلودہ کئے ہوئے ہیں اِن سے دامن بچانا۔یہ ایک طبقہ ہے جو سوچ پر پہرے ڈالے راہیں مفقور کئے کھڑا ہے۔اِس کتاب کو لپیٹ کر نہ رکھنا عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، طبیعات، دینیات، فلکیات، کے خزانے اِس میں موجود ہیں۔کلاسیکی آہنگ،اعلی درجے کا ادب، قصے کہانیاں،تمثیلات، زبان کی چاشنی، جملے کی دروبست ،ذہنی بالیدگی، روحانی مدارج، سائنسی معلومات،اول تا آخر ظہور ہونے والے واقعات اِس میں پنہاں ہیں۔

پتا کیسے چلے......؟؟؟کسی نے ڈوٹوک سوال پوچھا......

صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔تعصب کی عینک اُتار دو۔لولگا کر علم حاصل کرو۔سب عیاں ہو جائے گا۔

حکومت کس کو ملے گی؟

حکومت کس کو کہیں گے؟؟

حکمران کون ہوگا؟؟؟

صاف ستھرا جواب۔وہی جو سچ کا سپاہی ہوگا۔جو انسان کی فلاح کی خاطر اقدامات

بروئے کار لاتے ہوئے پورا پورا ناپ کرے گا۔ڈنڈی مارنے والے نامراد اور ناکام ہونگے۔تمناؤں اور خوابوں کے چورا پناسا منہ لئے رہ جائیں گے۔اِنسان کا نرم مزاج ساتھی جو آسانیاں پیدا کرے،خیر بانٹے،بھوکے کو کھانا کھلائے،پیاسے کو پانی پلائے،ننگے کو کپڑا پہنائے،اِنسانیت سے محبت اور اُسکی ضروریات پوری کرنیکا سبب بنے،دِلوں کا حکمران ہوگا۔وہی سب سے آگے ہوگا۔

اچانک وہ اُس ڈرگاہ بارے سوچنے لگا۔جہاں ایک بڑا جبہ پہنے،سر پہ امامہ باندھے، ہاتھ میں تسبیح لئے منمنائے جارہا تھا......سب ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہے تھے اُس کے منہ سے نکلا لفظ ہی سب کا اوڑھنا بچھونا تھا......کچھ اُسکی مٹھی چاپی کر رہے تھے تو کچھ مٹھی گرم کر کے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے......توسیع کی خاطر سامنے والی اراضی بھی تو انہی کی بدولت اُس نے ہتھیائی تھی جس پر اب عالی شان عمارت بن چکی تھی......وہ گاؤں چھوڑ سکینہ کی بیٹی خاوند کو قابو کرنے تسلسل سے حاضری دیتی رہی......شروع میں خود وظیفہ پڑھتے رہے اب اس کو اپنے دوسرے خلیفہ کے سپرد کیا جو یہ کام تندہی سے سرانجام دے رہا تھا اب کہ وہ خاوند سے چھٹکارہ چاہتی تھی مگر وہ راضی نہ تھا......چھٹکارے کیلئے عمل کرنا ضروری تھا سکینہ کی بیٹی عمل پورا کرنے میں جتی ہوئی تھی۔

کچھ دِنوں بعد اُسے تیسرے خلیفہ کے سپرد کیا گیا تھا جو ایک چھوٹی مسجد میں امامت کے فرائض بھی سرانجام دے رہا تھا۔سکینہ کو دَم کیا گیا پانی سے لبالب گلاس تھماتے ہوئے کہا گیا۔

گلاس کو سامنے پکڑنا ہے یاد رکھنا پانی کی بوند بھی نہ گرنے پائے......وہ بازو پھیلائے پانی پہ نظریں جمائے گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی......چٹیا پکڑ کے دَم شروع کیا گیا......ماتھے کا مساج ہوا......گردن پر ہاتھ پھیرے گئے تو اُسے کافی سکون ملنے لگا......پھر یہ عمل گردن سے نیچے کی طرف شروع ہوا۔جس سے اُسے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی تھی......جھرجھری کا محسوس ہونا دم کے صادق ہونیکی نشانی قرار پایا۔

اُس کے ذہن میں دوسرا واقعہ آن ٹپکا......وہ لُٹا پُٹا دکھائی دے رہا تھا......بیٹے کی نعش ویرانے سے اور بیٹی کی ندی کے کنارے سے مل چکی تھی......اُس نے چند روز پہلے سامنے والی اراضی خریدی تھی......اراضی کی خریداری پہ پہلے دھمکیاں اور پھر بدترین سزا دی گئی......وہ زمین لوٹا دینا چاہتا تھا پر بیوی کی رَٹ تھی......ہمیں زمین کی ضرورت ہے......آپ زمین واپس نہ کریں......ہم نے پیسے دیئے ہیں کل بچوں کے لیے سر چھپانے کو اپنی چھت تو ہو......ہماری طرح گلی گلی کرایہ کے مکانوں میں دھکے تو نا کھائیں۔وہ رونے لگی تھی۔

اوہوتم نہیں سمجھو گی ۔کبھی نہیں سمجھو گی ۔زمین کون سی کم ہوتی جارہی ہے ۔یہاں نا سہی تو کہیں اور سہی ۔وہ قدرے غصے میں کہنے لگا۔

خدارا اب واپس نہیں کرنی ......پھر ہم نہیں لے پائیں گے ......وہ لجاجت بھرے لہجے میں کہنے لگی ۔وہ اُس کے جذبات دیکھ کر اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہنے لگا ۔اچھا جیسا تم کہتی ہو ویسا ہی ہو گا۔

گلی کی نکڑ پر ایک لڑکی نے زہر پی لی تھی ......کوئی کہہ رہا تھا کہ بھلی لڑکی تھی نجانے کیوں یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئی ہے......اُن چہروں میں وہ بھی موجود تھے۔

جو اُس سے تعلقات استوار کرنے کے لئے عرصے سے ہاتھ پیر مار رہے تھے ......اور کئی ایسے بھی تھے جنھوں نے بے راہروی کی سند دے رکھی تھیں ......کئی اِس اندوہناک واقعہ پہ دُکھی بھی تھے۔

میں بستی کے ساتھ ملحقہ پہاڑی پہ جا بیٹھا ......درختوں کے جھنڈ تلے دُور تک پھیلی گھاس پر بیٹھ کر سگریٹ پینے کا لطف ہی اور ہے ......سایہ دار جھاڑیاں ......پرندوں کی چہچہاہٹ اور مدھر آوازیں جو ایک دلآویز موسیقی کی صورت اختیار کر لیتیں ......میں اکثر شہر کی پر شور، ہنگامہ خیز اور آلودہ فضاء سے نکل کر یہاں آ جاتا ہوں ......میں نے سگریٹ سلگائی اور اُسے غور سے دیکھنے لگا ۔کوئی کیا جانے کہ سگریٹ کا سلگنا میرا ہی تو سلگنا ہے ......زندگی بھی تو اِسی طرح سلگ سلگ کر گزرتی جارہی ہے ......دھیرے دھیرے اپنے انجام کی جانب گامزن رہتی ہے ......مجھے یاد آیا ۔

وہ بار بار مجھے سگریٹ چھوڑنے کی ضد کیا کرتی تھی ......میں اُس سے کئی بار شرط لگا کے سگریٹ چھوڑ بھی چکا تھا ......مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ سگریٹ مجھے نہیں چھوڑنا چاہتے ......میں سگریٹ کی بے لوث محبت کے سامنے خود کو بے بس اور لاچار تصور کرتا ہوں ......یہ میری اداسیوں میں ہمیشہ میرے ساتھ رہا خود تو دھیرے دھیرے، دھیمے دھیمے، ہولے ہولے سلگتا رہا مگر میرے من کو چین اور میرے زخموں پہ پھاہا بھی رکھتا رہا......

میری نگاہوں کے سامنے اَب وہ گھومنے لگا......اُس دن کافی برداشت کے باوجود بھی اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا......مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا......ہم مرد بڑے بدنصیب ہوتے ہیں ......رُونا چاہیں تو رُو بھی نہیں سکتے ......رُونے کا طعنہ جو دیا جاتا ہے ......اِس طعنے سے بچنے کی خاطر آنسوؤں کو باہر کے بجائے اندر بہانا پڑتا ہے اور یہ کم بخت آنسو جوں جوں اندر کی جانب بہتے ہیں توں توں اندر کی آگ کو مزید بھڑ کاتے رہتے ہیں۔

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا......ہاں ......تم ٹھیک کہتے ہو! ......آنسو

باہر بہنا پسند کرتے ہیں اوراندر کے بہاؤ سے کتراتے ہیں ......اسی لئے تن من میں آگ بھر دیتے ہیں ......وہ ٹکٹکی باندھے میری آنکھوں میں دیر تلک کچھ تلاش کرتا رہا......

جب اندھیرے منہ فیکٹری ملازمین کو اٹھانے بس آتی تو ہر عمر کی عورتیں اورلڑکیاں اُس میں شامل ہوتیں وہ بھی اُن کے ساتھ سفر کیا کرتی تھی ......مرد بس کی ایک جانب کی سیٹوں پہ اور عورتیں دوسری جانب بیٹھ جاتیں ......راستے میں بے شمار بھکارنیں کئی راہگیر بھی بس کو رکنے کا اشارہ کرتے مگر وہ کسی کے لئے نہ رکتی ......فراٹے بھرتی اپنی منزل کی جانب گامزن ......راستے بھر لوگ دائیں بائیں بیٹھے لوگوں سے حال احوال لیتے ...... ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی ...... باہر کے مناظر بدلتے جاتے ......کہیں ڈھول اڑتی تو کہیں نیلے آسمان کا نظارہ ہوتا ......کہیں گھنے درختوں کی قطاریں تو کہیں وسیع میدانوں اور کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ......مسافر ہر منظر سے لطف اندوز ہوتے ۔

وہ اپنی نشست پر سمٹی بیٹھی رہتی ......سر پہ سکارف ،جسم ڈھانپے ،چہرہ چھپائے ،نظریں جھکائے ......اپنی ہی سوچ میں گم ......کبھی کبھار جب ڈرائیور کہیں غلط اوورٹیکنگ کرتا یا کہیں جمپ یا جھٹکا لگتا تو سواریاں سامنے والی سیٹوں کی ہتھیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتیں ......تو وہ بھی دائیں یا بائیں سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتی اُسوقت اس کی نظریں بھی قدرے اُٹھا کرتیں تھیں ۔

وہ سنجیدہ مزاج ،خاموش طبع اور پراسراری لڑکی تھی ......ایک عرصے سے وہ اس گاڑی میں سفر کر رہی تھی ......اُس کا چہرہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا ......وہ سب سے آخر میں سوار ہوتی اور سب سے آخر میں گاڑی سے اترتی تھی ......کئی نوجوان اس میں دلچسپی بھی لیتے مگر اُسے کسی میں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔

پھر اُس کے بارے میں یہ خبر پھیل گئی کہ اُس کا تو چہرہ ہی نہیں ہے ......وہ نوکری چھوڑ کے شہر بدل چکی تھی ......وہ کسی زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی ......والدین کی اکلوتی اولاد تھی ......والدین کا سایہ ہٹ جانے پر خاندان والوں نے زمین کے کاغذات پر دستخط کرنے کا کہا تو اُس نے انکار کر دیا تو اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا گیا ......

پھر یہ وسیع زمین اُس کے لئے دن بدن کم پڑتی گئی اور وہ شہر بہ شہر دھکے کھانے لگی ۔

اس کی بیوی کو بھی زمین کم پڑنے کا قلق تھا ......آئے روز ان کا صرف ایک بات پہ جھگڑا ہوتا وہ کہتی زمین کم پڑتی جا رہی ہے اور تم اس بارے کچھ نہیں سوچتے ......پھر طعنے دیتے ہوئے کہتی ......وہ بھی کوئی مرد ہے جس کے پاس سر چھپانے کے لئے اپنا گھر تک نہ ہو ۔

وہ بار رہا کہہ چکی تھی ......نگر نگر کے پڑاؤ مجھے پسند نہیں ......وہ از راہِ مذاق کہتا ......
زندگی بذاتِ خود ایک سفر ہے اور سفر میں مسافر کا کسی ایک جگہ ٹھہر جانا اس کے سفر کے اختتام کی دلیل بن جاتا ہے......مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ بس جیسے تیسے زمین لو اور اپنا گھر بناؤ۔

وہ زمین کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے لگا تب اُسے پتہ چلا کہ واقعی زمین تو کم پڑتی جا رہی ہے......پیسے کی ریل پیل نے زمین ختم کر دی ہے۔

اس نے شہر سے دُور ایک پہاڑی کے عقب میں جگہ خریدنے کا فیصلہ کیا...... یہ علاقہ غیر آباد تھا...... جب جگہ خریدی تو کئی دوست اس کا مذاق اڑانے لگے......مگر چند ہی مہینوں میں جا بجا عالیشان عمارتیں راتوں رات بنائی جانے لگیں پھر وہاں بھی ہر زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ زمین کم پڑتی جا رہی ہے......میرے ہاتھ میں سلگتا سگریٹ ختم ہو چکا تھا......سورج غروب ہونے کو تھا......روشنی ماند پڑ رہی تھی اندھیرے چھانے کو تھے......میں نے پہاڑی سے نیچے بستی پر نگاہ ڈالی تو وہاں آبادی نہ تھی......حدِ نگاہ تک درخت ہی درخت......سبزہ ہی سبزہ......خود رو پودے......جھاڑیاں......شاید میں جنگل میں بیٹھا تھا۔

جنگل!......جنگل کا خیال آتے ہی مجھ پر خوف سا طاری ہونے لگا......اور مجھے اپنے چاروں اور جنگلی خون خوار بھیڑیے گھومتے پھرتے نظر آنے لگے۔

اُن کے منہ خون سے بھرے ہوئے اور چہروں پہ خون جما ہوا تھا۔

مجھے گھٹن سی محسوس ہونے لگی سانس لینا محال ہونے لگا۔

اچانک بے ربط آوازیں میرے گرد گونجنے لگیں۔

اِسے جلا دو......اُسے گرا دو......اِسے مار دو......اُس سے چھین لو۔

ہر آواز اپنے اندر قہر لئے ہوئے تھی۔

اُس کی لاش دو دن ہسپتال کے مردہ خانے میں پڑی رہی......جب نعش کے کپڑوں کو ٹٹولا گیا......تو صرف ایک کاغذ برآمد ہوا۔

باہر ایک باوردی سپاہی کے سامنے بنچ پر ایک بوڑھا خمیدہ کمر اداسی کی تصویر بنے بیٹھا تھا اُس کے چہرے سے اس کا اضطراب عیاں تھا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو بارش کے قطروں کی مانند زمین پہ گر رہے تھے ہر قطرہ اپنے اندر ایک سوال لئے ہوئے تھا۔

بابا جی......آپ کے بیٹے کی جیب سے صرف ایک کاغذ ملا ہے......عملے کے ایک شخص نے

کاغذ تھماتے ہوئے کہا۔
کیا اس نے خودکشی کی؟؟ ......بابا کاغذ لیتے ہوئے مضطرب سا دِکھنے لگا......
نہیں بابا جی ......اس نے بے رخی سے جواب دیا اور سامنے والے کمرے کی جانب چل
دیا......جواب سن کر بابا کے چہرے پہ پھیلا اضطراب قدرے کم ہو چکا تھا۔
کاغذ پہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا تھا۔
میرے پیارے بابا جان ......اسلام علیکم ......میں نے قلم اور قرطاس سے رشتہ جوڑے رکھا
پر جو معاشرہ الفاظ کی حرمت کو گنوا دے وہاں ظلم پروان چڑھتا ہے۔
میں نے اپنے تئیں اپنا فرض پورا کیا اور قلم کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی......میں بہت پہلے
ہی قتل کر دیا جاتا ......پر جو وقت معین ہے اُس سے انکار نہیں......میں فخر سے قبر میں اتر ونگا۔
میں ظلم کو نہ روک سکا پر اپنے حصے کا کام بخوبی سر انجام دے چلا ......یہ لوگ میری نعش سے
ٹپکتے لہو کو نجس کہہ کر پکاریں گے مجھ پہ طعن و تشنیع کریں گے بابا جان......میں آپ کا بیٹا ہوں۔
وقت ثابت کر دے گا کہ میں ایک عظیم باپ کا بیٹا تھا......جو قلم اور قرطاس کی حرمت کیلئے
سولی پر چڑھنے کیلئے تو تیار ہوا مگر حق سے منحرف نہیں ہوا۔
بابا جان!......میں سچ کے راستے کا سپاہی تھا حالت جنگ میں شہید کر دیا گیا ہوں۔آپ
مجھ پہ فخر کیجئے گا آپ ایک شہید کے والد ہیں آپ کا بیٹا......خرم دانیال!
دوسرے دن کی اخبار کی سرخی قلم اور سیاہی کی صداقت پر تو مبنی تھی مگر قلم اور الفاظ اپنی حرمت
کھو چکے تھے۔
میں نے زمین کو دیکھا......تو مجھے زمین کم پڑتی محسوس ہونے لگی۔
میں وہاں سے اٹھا تو مجھے لگا میرا منہ تھوک سے بھرا ہوا ہے میں نے جونہی تھوکا تو تھوک
کی بجائے خون چاروں طرف پھیل گیا غیر دانستہ میرے ہاتھوں نے ہونٹوں کو جا چھوا جب
ہاتھوں کو دیکھا تو ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے......خون دیکھ کر دل متلانے لگا عجیب سی سرانڈ
خون سے آ رہی تھی ......مجھے قے ہونے لگی ایسا لگا کہ سب کا سب اندر سے باہر آنے کو ہے۔
اچانک میرے اندر سے خون باہر کو اُمڈ پڑا چاروں اور خون ہی خون پھیلنے لگا۔قدم اٹھایا تو میں چل
نہ پایا ......ہاتھوں کے بل زمین پر گر گیا ......پھر میں تیزی سے ہاتھوں اور پاؤں پر ڈگ بھرتا نیچے کی
جانب دوڑنے لگا۔اُس لمحے سب بھاگ رہے تھے۔شاید زمین سکڑ رہی تھی؟؟؟

سراغ

''تم ایک ایسے مسافر ہو......جس کا کوئی مسکن نہیں......''

قد آدم آئینے میں جھلملاتا میرا عکس مجھ سے الجھ پڑا......وہ میرے وجود کا منکر مگر اپنے ہونے کے اقرار پر بضد تھا۔

جنگ جاری ہو چکی تھی......مگر جیتے گا کون......؟؟

''تمہاری آنکھیں ذرہ بھی خوبصورت نہیں''

''کیا آنکھوں کی خوبصورتی زیادہ اہم ہے یا بینائی......؟؟؟......میں نے اُس کے وار کا جواب دیا اور غیر ارادی طور پر جب میں نے اپنے اندر جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر جھانکا...... چاروں اور سیاہی ہی سیاہی تھی......گہری تاریکی دیکھ کر ایک انجانے سے خوف سے میرا وجود تھرا اٹھا۔

''اتنا گہرا اندھیرا کیوں ہے؟''......میں سوچنے لگا۔

''اندھیرا اسقدر بھی ہو سکتا ہے؟''......میں نے خود سے سوال کیا۔

''مگر......میں اس وقت کہاں ہوں؟ سفر میں ہوں یا حضر میں؟؟......کیا مجھے کسی منزل کی تلاش ہے؟......کونسی منزل؟ کہاں کی منزل؟......کہاں ہے منزل؟؟؟

منزل کا سوال ذہن میں آتے ہی مجھے اپنی سمت کے تعین کا خیال آیا۔

''کہیں میں بے سمت کا مسافر تو نہیں؟......بے سمت کا مسافر!!!''......اس سوچ کے

ساتھ ہی مجھے حد درجہ تھکاوٹ کا احساس ہوا۔

گھٹاٹوپ ...... گہری تاریکی ...... بے منزل اور بے سمت سفر۔

جب خوف اور بے یقینی کے سائے گہرے ہونے لگے تو میرا جسم بے حس اور ٹانگیں بوجھل ہونے لگیں...... میں نے اپنے بدن کو چھوا ...... وہ سلامت تھا۔

''منزل کس طرف ہوگی؟'' ...... میں سوچنے لگا مگر کچھ سجھائی نہ دیا۔

میں نے آئینے میں دیکھا تو وہاں میرا عکس موجود تھا...... اُسے دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوا۔

میں آئینے سے باہر نکل آیا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری آنکھوں کی بصارت ذائل ہو چکی تھی یا پھر گہری تاریکی میں میرا عکس کہیں کھو چکا تھا...... میں نے گھبراہٹ کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھوا تو میری سٹی گم ہو گئی...... میری آنکھوں کی جگہ محض دوگڑھے تھے...... دو تاریک غار! ...... میں خوف کے مارے چلا اٹھا...... ''میری آنکھیں کہاں گئیں؟'' ...... میرا پورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میں نے آئینے میں جھانک کر دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی ...... وہاں عکس میں میری دونوں آنکھیں موجود تھیں ...... آئینہ میرے ہونے کی گواہی دے رہا تھا...... آئینے میں میرا وجود مضبوط اور چہرہ شاداب تھا۔

''میں ہوں! ...... یہ ہوں ......'' ...... میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا ...... میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں ...... میں دیکھ سکتا ہوں ...... مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ یہ احساس میرے اندر ایک قسم کی طمانیت کا سبب بنا۔

اور آئینے سے باہر؟

مجھے آئینے سے باہر کی خبر نہیں لینی چاہیے ...... میں نے خود کو سمجھایا۔

میں ایک مدت سے محوِ سفر ہوں ...... میرا ہدف منزل کی تلاش ہے۔ میرے لئے یہی کافی ہے...... ورنہ یہاں تو ہزاروں لاکھوں ایسے ہیں جو سفر شروع ہونے سے پہلے ہی اپنا ارادہ توڑ دیتے ہیں۔

''میں کیوں مسلسل چل رہا ہوں؟'' ...... یہ سوال پھر میرے ذہن میں در آیا۔

"مجھے سفر کی عادت ہے......سفر میرا مشغلہ ہے......اور یہ مشغلہ اب میرا جنون بن چکا ہے"۔

میں نے اپنے اندر جھانکا......گھپ اندھیرا......تاریکی......ظلمت......تیرگی!......

میرا جی متلانے لگا۔اِس سے قبل کہ مجھے قے آجاتی......میں الٹے پاؤں بھاگ آیا۔

آئینے میں عکس موجود تھا......مجھے کس کی تلاش ہے؟؟؟میں تو آئینے میں موجود ہوں!

شاید میرے اندر کوئی محوِ سفر ہے......بے منزل کا مسافر......بے سمتی کا مسافر......!!!

اچانک مجھے اپنے اندر کسی کے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔

"میرا وجود کہاں ہے؟"

"آئینے میں"۔

"نہیں!وہاں تو میرا عکس ہے!"

"پھر میں کہاں ہوں؟؟"......میں خود کو تلاش کرنے لگا۔

میں آئینے کے سامنے تھا......اپنے وجود کو چھو لینے کا احساس بھی تھا......میرا جسم دسمبر کی یخ ٹھٹھرتی رات کی طرح سرد تھا اور میرے اندر ایک قسم کی ایک دوڑ جاری تھی...... بھاگم بھاگ......ایک غیر مرئی وجود اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لئے مضطرب تھا......اُسے اِس گتھی کو سلجھانے کی پڑی تھی......وہ اس راز کا سرا تلاش کرنا چاہتا تھا......مگر سرا مل نہیں پا رہا تھا۔

اِسی دوڑ دھوپ میں وہ ایک سرے سے دوسرے تک بھاگم بھاگ سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

اس کے یوں بے ہنگم دوڑنے سے میری سانسیں پھولنے لگیں......سانسوں کا بحال رکھنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا......دِل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی......دل کا ردھم برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

تاریکی کے جنگل میں سفر جاری رکھنا محال ہو رہا تھا......اِس جنگل میں موجود خود رُو خاردار جھاڑیوں کے کانٹے میرے بدن پر نشتر زنی کر رہے تھے......تاریکی کی امر بیل میرے وجود کو جکڑ چکی تھی......میرے لئے سفر کو جاری رکھنا محال ہو رہا تھا......اور منزل کا تعین بھی ناممکن تھا۔

سوالات تھے کہ لاینحل!

میں یقین اور گمان کے درمیاں کہیں فٹ بال بنا پھر رہا تھا ......منزل کی ڈور کا سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

غیر مرئی وجود کچھ دیر ستانے کے بعد پھر دوڑنے لگا ......اَب اُسے منزل کے بجائے نشانِ منزل کی جستجو تھی ......اُسے یقین تھا کہ ایک بار نشانِ منزل ہاتھ آ جائے منزل خود بخود مل جائے گی ......اِس احساس اور منزل پا لینے کی اُمید نے اُسے پھر سے تازہ دم کر دیا تھا۔

میں نے اپنے عکس پہ نظریں جمائیں تو اپنے ہونے کا احساس مجھے سرشار کر گیا۔

اس نے دوبارہ سفر شروع کر دیا تھا ......لیکن اب کی بار اس نے آگے کے بجائے پیچھے کی جانب سفر شروع کیا ......الٹے سفر پر جاتے ہوئے اس کے قدموں کی آہٹ مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی ......وہ دھیرے دھیرے اور نپے تلے قدموں سے پیچھے کی جانب جانے لگا۔ جوں جوں وہ قدم پیچھے کی جانب اٹھا تا توں توں سیاہی ملگجے میں بدلتی جا رہی تھی ......

اب کی بار اس کا سفر انتہائی دشوار، کٹھن اور صبر آزما تھا ......لیکن اس نے اسے سر کر ہی لیا ......وہ سرے کے پاس جا پہنچا ......اُس آخری سرے پر گہری کھائی تھی ......نیچے جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی ایک مہیب گڑھا تھا اور اُس گڑھے کی مہیب گہرائی میں شفاف مائع پھیلا ہوا تھا جس میں خاکستری ذرات تیر رہے تھے۔ گڑھے کے کونوں کھدروں میں ننھے منے پودے پھوٹ رہے تھے ......گڑھے کے اطراف میں مختلف اقسام کی جڑی بوٹیاں اگ آئی تھیں ......اِس سے نیچے نظر کا جانا محال تھا۔

میں یہ بھول چکا تھا کہ میری تو آنکھیں ہی نہیں ہیں۔

غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ میرے چہرے کی جانب لپکے ......مجھے ایسے لگا جیسے میری دونوں آنکھیں اُگ آئی ہوں اور ان کی بینائی نے مجھے بینا بنا دیا ہے ......میں اپنی آنکھوں سے اندر اور باہر، ظاہر اور باطن سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا ......آئینے میں عکس اور عکس کی آنکھیں ...... اندر دیکھنے سے یکسر قاصر تھیں ......میرے باطن کی آنکھ کیا کھلی کہ ہر سو اُجالا ہی اُجالا ہو گیا ......میں نے کھوج پا لیا تھا!!!

نئی کہانی

''تم ایک کہانی لکھو......نئی کہانی ......بالکل نئی ......ایسی کہانی جو پڑھتے ہی دِل میں اتر جائے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے'' ......کہانی کار اُس کے الفاظ سن کر زیرِ لب مسکرانے لگا ......مگر اُس کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر پوچھنے لگا ......

''اچھا تو یہ بالکل نئی کہانی کیسی ہو؟''

''جو پڑھتے ہی دِل میں اتر جائے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے'' ......اُس نے پہلے والے الفاظ ہی دُہرائے۔

''زندگی کے جن المیوں اور سانحات ہمیں گھیر رکھا ہے اُن پر مبنی ہو یا محبت کی کوئی ٹوٹی بکھری واردات؟'' ......کہانی کار نے اُسے کریدا۔

''شاید تم مذاق سمجھ رہے ہو......مگر میں مذاق نہیں کر رہا'' ......وہ کہانی کار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میرے خیال میں، تمھاری کہانی ہی لکھ دی جائے'' ......کہانی کار نے قدرے سنجیدگی سے ہوا میں تیر پھینکا۔

''مجھ پر؟ مجھ پر کیا لکھو گے؟ ......میرے پاس ہے ہی کیا؟'' ......اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''کہانی تو سب کی ہوتی ہے......تمھاری بھی تو ایک کہانی ہے...... جسے لکھا جا سکتا

ہے“ ......کہانی کار نے مسکراتے ہوئے کہا۔
اب مجھے نہ بتاؤ، بلکہ کہانی کے بارے سنجیدگی سے سوچو......”اچھا جناب“ کہانی کار خاموش ہوگیا......
لکھو گے یا نہ......مجھے جواب دو“ وہ دوٹوک جواب پہ بضد تھا......
”اُو......ہو! کیا تم نہیں جانتے کہ اب کہانی نہ تو سنائی جاتی ہے اور نہ ہی سنی جاتی ہے۔ اگر لکھی جائے تو پڑھی نہیں جاتی اور اگر پڑھی جائے تو اُس سے کوئی سبق نہیں لیا جاتا ہے۔ پھر کہانی لکھنے کا فائدہ......؟؟؟
”تمھیں کیا ضرورت پڑی ہے جو لوگوں کو سبق پڑھاؤ......تم کہانی کار ہو تم صرف کہانی لکھو......کوئی سُنے نہ سُنے......کوئی پڑھے نہ پڑھے......اِس سے تمھیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے“......وہ کہانی کار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا
”ہا---ہاہا......! خوب جناب!“۔ کہانی کار کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔
”مجھے لگتا ہے تم میری باتوں کو مزاق سمجھ رہے ہو، مجھے جواب دو، کہانی لکھو گے یا نہیں؟“---اس نے پھر دوٹوک جواب مانگا۔
”دیکھو میں ایک عرصہ سے کہانیاں لکھ رہا ہوں......ایک اور کہانی کے اضافے سے بھلا کیا ہوگا؟ پہلے کیا کم کہانیاں لکھی ہیں“۔ جواب سنتے ہی اس کے سنجیدہ چہرے پہ پھیکا گواری کے اثرات نظر آنے لگے......اُس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اِس جواب سے خوش نہیں۔
”اچھا بھائی! اب موڈ ٹھیک کرو میں کہانی لکھوں گا“
”وعدہ!“......اُس نے اپنا ہاتھ کہانی کار کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
”ہاں وعدہ......“ کہانی کار نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے گرم جوشی سے دبایا۔
رات کہانی کار اُس سے ہونے والی گفتگو بارے سوچنے لگا......ایک کہانی کئی دنوں سے اُسے لکھنے پہ اُکسا رہی تھی مگر نجانے وہ اِس وقت کہاں کھوگئی تھی......بات کہانی کی نہیں اُس کے نئے مواد کی تھی......وہ اِسی بارے سوچنے لگا۔

چار گھر چھوڑ کر ایک جھونپڑے کے مکینوں کی بھوک بارے لکھا جائے تو کیا فائدہ؟
سب جانتے ہیں وہ بھوکے ہیں ......اُن کی بھوک بھری کہانی سے بھلا کسی کو کیا سروکار؟
ایسی کہانیاں اخبارات، رسائل اور ٹی وی اپنی خبروں، خصوصی ایڈیشنوں اور پروگراموں میں پیش کر کے خوب رقم بٹور رہے ہیں ......اَب اگر میں بھی اِسی تنگ اور افلاس پہ لکھنا شروع کر دوں تو بھلا یہ کون سی نئی کہانی ہو گی ......جو پڑھتے ہی دل میں اترے گی اور دماغ میں ہلچل سی مچائے گی ......دوست کی جانب سے نئی کہانی لکھنے کے تقاضے کا خیال آتے ہی اس کی سوچیں گڈمڈ ہونے لگیں۔

ایک خیال چند دِنوں سے اس کے دِل کے نہاں خانے میں اٹھکیلیاں لے رہا تھا ......وہ جو ایک جانب سے آستین اور دوسری جانب سے بغل چاک کیے کالے کپڑے پہنے اُپنے سفید جسم کی جانب راغب کر کے بھیک مانگ رہی تھی ......جس کا جسم نزدیک سے دیکھنے، اُس سے آنکھیں چار کرنے اور ہاتھ چھونے کی خاطر بے شمار لوگ اپنی جیبیں ٹٹولتے ......پھر نجانے وہ کس ترازو میں اُن کا تول کرتی اور کچھ دیر کیلئے کسی نہ کسی کے ساتھ غائب ہو جاتی ......اُس کے دیکھنے کا انداز بھی تو نرالا تھا ......جس کو آنکھ بھر کر دیکھ لیتی وہ اُسی کا ہو کر رہ جاتا ......بعض اُسے دیکھ کر ہی ٹھیں ٹھیں کرتے ......ایسوں کو وہ منہ نہ لگاتی ......وہ کچھ وقت کیلئے غائب ہوا کرتی تھی ......وہ کہاں جاتی اور کس کے ساتھ جاتی تھی؟ یہ سوال اپنی جگہ پر مگر یہ تو اُس کا روز کا معمول تھا ......یہ تو کوئی نئی کہانی نہیں جسے پڑھتے ہی قاری کے دماغ میں ہلچل سی مچ جائے۔
وہ نوجوان گاڑی نہیں چلا سکتا تھا مگر کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا ......کئی لوگوں کی زندگیوں کے چراغ گل کرنے کا سبب بنا ......اِس پس منظر میں ایک کہانی بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے لکھو، لیکن یہ بھی کوئی نئی کہانی تو نہ ہوئی ......ایسی کہانیاں تو ہر روز اور ہر جگہ جنم لیتی ہیں۔
اچانک اس کی نظر سامنے پڑے ہوئے اخبار پہ جا ٹکی ......ہولناک حادثہ اور قیمتی جانوں کا نقصان ......چوکھٹے میں زخمیوں کی تصویریں اور نیچے مرنے والوں کے نام ---کٹے پھٹے جسم -یہ کہانی بھی پُرانی کہانی ہے۔ میں وہ کیوں نہ لکھوں جس کے متعلق عرصے سے سوچتا چلا آ رہا ہوں۔
اُس دِن کے کھانے جیسا مزا آج تک نہیں آیا۔ کھایا بھی تو خوب تھا ......مکئی کی تازہ روٹیاں ......سرسوں کے ساگ کے ساتھ سونچل کا ساگ ......گڑ و نچی میں لسی ......تازہ پودینے کے

ساتھ کچھ تمبر کا چھڑکاؤ......چار ہری مرچیں، ٹماٹر اور لہسن کو مکس کر کے بنائی گئی چٹنی، جس میں وہی کی آمیزش بھی تھی ......مکھن کا پیڑا ......مٹی کے فرش پہ بچھایا گیا دسترخوان ......کھانے کے بعد ہم گاؤں دیکھنے نکلے ......کبھی ایک پہاڑی پہ چڑھتے تو کبھی دوسری پہ جا پہنچتے ......سامنے لہلہاتے کھیت، تا حدِ نظر پھیلا سبزہ ہی سبزہ ......برہنہ پاؤں ...... جب سبزے پر چند قدم ہی چلے تو ٹھنڈک پاؤں سے دماغ تک سرایت کر گئی......مٹی کی مہک کا نعم البدل کوئی نہیں ......شبنم کے قطرے سبزے اور پھولوں سے اپنی لازوال محبت کا دَم بھرتے آخری سانسیں لے رہے تھے ......پرندوں کی آوازوں میں ردھم اور ٹھہراؤ تھا ......شائد وہ باری باری ایک دوسرے کو پکارتے تھے ...... پہلے ایک بولتا تو سب اُس کی سنتے ......پھر وہ خاموش ہو جاتا تو دوسرے اُسے کہیں دُور سے جواب دیتے ......کچے مکان، بھوسے کی اُڑتی دُھول، چشمے کا ٹھنڈا پانی، سامنے جوان لڑکیاں سروں پہ پانی کے گھڑے اُٹھائے اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو جا رہی تھیں ......ایک طرف کچھ عورتیں درانتی سے درختوں کی ڈالیاں اور ٹہنیاں کاٹ رہی تھیں جب کہ نیچے کھڑی اُن ڈالیوں اور ٹہنیوں سے پتے الگ کرتیں جو مویشوں کے چارے کا کام دیتے ......مرد درختوں سے ڈال اتارتے جنہیں خشک کر کے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ...... بوڑھی عورتیں آلتی پالتی مار کر ذکر کے ساتھ ساتھ سبزیوں کو کاٹتیں اور ساتھ ہی اپنی بہو بیٹیوں سے کہتیں کہ کام جلدی نمٹانے میں ہی برکت ہوتی ہے ......مگر اب گاؤں کی اکثر آبادی شہروں میں منتقل ہو گئی ہے......گاؤں کے پس منظر پر لکھا جائے تو یہ کہانی بھی کوئی نئی کہانی نہیں ہو گی جو پڑھتے ہی دِل میں اُترے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے۔اچانک بجلی نے سسکی لی اور اس کی یکسوئی میں خلل ڈال دیا......وہ خود کو کوسنے لگا کہ آج کیوں اُس کی سوچ کسی ایک نقطے پہ مرتکز نہیں ہو پا رہی۔

شاید اُسے پیاس ستا رہی تھی تبھی تو ذہن کسی بات پہ ٹک نہیں رہا تھا......گلاس بھر پانی پی لینے کے بعد بھی بے چینی اُسی طرح تھی ......وہ سگریٹ کی ڈبیا ٹٹولنے لگا مگر وہ مل نہیں پا رہی تھی۔ سوچوں میں کوئی ربط نہ تھا......بے سروپا خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس میں کہانی نام کی کوئی شے نہ تھی ......اُسے خود پہ غصہ آنے لگا۔شاید آج وہ کچھ بھی لکھنے کے قابل نہیں ......اُسے لگا کمرے میں دُھواں ہے۔اِس قدر دُھواں کہاں سے آ گیا؟ کہیں آگ تو نہیں لگی ہوئی؟ اُس نے

تمام کمروں کا جائزہ لیا اور سامنے والی کھڑکی کھول دی ...... تازہ ہوا کمرے میں موجود دھوئیں کو دھکیلنے لگی ......دونوں میں مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔

اُس کے خیالوں میں ساحلِ سمندر آ ٹپکا ......تا حدِ نظر سمندر پہ سورج کی کرنیں پڑ رہیں تھیں۔سمندر تو یکسر خاموش تھا مگر سورج کی کرنیں اپنی تپش سے اُس کے پانی کو بخارات میں بدلتی جا رہی تھیں ......سَمندر سُورج کے سامنے بے بس اور لاچار سا دکھائی دے رہا تھا......سورج اُس کی بے بسی پہ خوب ہنس رہا تھا ......لاچارگی اور بے بسی پر سب اسی طرح ہنستے ہیں ......وہ زیرِ لب بڑبڑایا ......اُوہو! میں کن سوچوں میں غلطان ہوں۔میں نے تو نئی کہانی لکھنی ہے ......جو پڑھتے ہی دِل میں اُترے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے......وہ خود سے ہمکلامی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ناٹک جاری تھا......اُن کا لیڈر حقیقت کے برعکس بولے جا رہا تھا......سامنے بیٹھے لوگ اس کی لایعنی اور بامعنی ہر بات پر بغلیں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ...... ایک جانب کچھ لوگ باہم دست و گریبان ہونے کو تیار کھڑے تھے تو دوسری جانب والے ہشت مشت ہو چکے تھے ...... اِن جھوٹے چیرہ دستوں کی مکاریوں اور فنکاریوں پہ لکھا جائے ......تو بھلا کیا ہو گا ......؟ کچھ اِن کی کاسہ لیسی کا حق ادا کرنے کی خاطر اول فول بکنا شروع کر دیں گے۔اور اس بات کا ڈھنڈورا اتنی شدت سے پیٹا جائے گا کہ سچ جھوٹ میں ہی کہیں گم ہو کر رہ جائے گا ......عوامی سوچ کے دھارے ہی بدل جائیں گے...... رمز شناس اپنا سا منہ لے کے رہ جائیں گے۔ان کا ایمان ہو گا اور وہ مات کھاتے نظر آئیں گے......کئی رخنہ ڈال کر کھیل بدل دیں گے اور پھر کھینچا تانی میں وہی سامنے آئیں گے جو برسوں سے آپس میں ہی لے دے کر رہے ہیں ......بھلا یہ کون سی نئی کہانی ہے ......جو پڑھتے ہی دِل میں اترے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے......؟؟؟

گرمی نے اَنت مچا رکھی تھی ......اُسے بار بار پیاس ستا رہی تھی ......بازار سنسان، گلیاں ویران لوگ گھروں میں دُبکے بیٹھے تھے ......پانی نہ بجلی، گرمی نے تن بدن میں آگ سی لگا رکھی تھی ......جہاں بنیادی ضروریات ناپید ہوں ......ذہن کسی بات پہ ٹکتا ہی نہ ہو......قدم قدم پہ مسائل اژدھا کی طرح ڈنگ مارنے کو تیار ہوں ......وہاں اگر نئی کہانی لکھی بھی جائے گی تو بھلا

کون اُس کہانی کو پڑھے گا......اچانک بجلی آ گئی۔

سامنے پڑے ہوئے کاغذات اِدھر اُدھر اُڑنے لگے ......ٹی وی آن ہو چکا تھا۔ شاید بجلی جاتے وقت وہ سوئچ آف کرنا بھول گیا تھا......کوئی فلم چل رہی تھی ......لڑکی محبت بھرے ڈائیلاگ بول رہی تھی ......اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو، چہرے پہ پھیلا قرب اور سسکتی لرزتی آواز میں محبت کا عہدو پیمان۔۔۔!

وہ سوچنے لگا ...... ہمارے ہاں فلمیں ملکی اور بین الاقوامی مسائل، معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں، بے روزگاری سے چھٹکارے، عوامی سوچ میں بڑھوتری، نوجوانوں کی درست سمت میں رہنمائی، دہشت گردی کے خاتمے، ایک خطہ زمین پر بسنے والوں کو قوم بن کر جینے کے ڈھنگ پر کیوں نہیں بنائی جاتیں ...... جو بھی فلم یا ڈرامہ دیکھو وہ کسی ماورائی دُنیا کی کہانی محسوس ہوتا ہے۔ کیا اس طرح معاشرہ تنزلی کا شکار نہیں ہو رہا......؟ اچانک بجلی نے پھر الوداع کہہ دیا ......اُس کے منہ سے بے اختیار ایک موٹی سی گالی پھسل گئی۔

اَب اُس کی نظر سامنے لٹکی فریم پہ جا ٹکی تھی ......موم بتی جلتے جلتے اپنے انجام کو پہنچتی نظر آ رہی تھی۔ ایک جانب کھلی کتاب پڑی تھی ......اور پہ علم حاصل کرنے کا حکم بھی تحریر تھا......بجلی پھر آ گئی ......وہ پھر سوئچ بند کرنا بھول گیا تھا سو ٹی وی بھی آن ہو گیا۔ اب سکرین پر لڑائی کا منظر تھا...... حق اور باطل آمنے سامنے ......باہم گتھم گتھا ......ایک جانب کچھ لاشیں پڑی تھیں ......حق والے باطل کو مٹا دینے کے دَرپے تھے ......دُور دُور تک خون ہی خون بکھرا تھا ......دونوں جانب سے لوگ جدید اسلحہ اٹھائے ایک دوسرے پر بے دریغ گولیاں برسا رہے تھے ......اُس نے چینل بدلا ...... زلزلے کے مناظر دکھائے جا رہے تھے ......بڑی عمارتوں کا انہدام ......لوگوں کی چیخ و پکار......آہیں اور سسکیاں ......حد نگاہ تک چھوٹے بچوں کے قطاروں میں لاشے ......ایک جانب کچھ عورتیں بین کر رہی تھیں ......اُف ......اُس نے ٹی وی بند کر دیا اور نئی کہانی کے بارے سوچنے لگا۔

اچانک ایک پرانا خیال گھومتا گھامتا اُس کے دماغ میں آن اٹکا......ہاں ......یہ نئی کہانی بن سکتی ہے ......وہ چونکا......پر......؟؟؟......خود کو ننگا کرنا کون سی نئی کہانی ہو گی؟ کیا مجھے ایسی کہانی لکھنا چاہیے، جس سے میں خود بھی ننگا ہو جاؤں؟......وہ تذبذب کا شکار تھا

گرمی زوروں پہ تھی ......جسم پسینے میں نہا رہے تھے ...... پسینے کی سرانڈ طبیعت کو متلا دیتی ......کپڑے جسم سے ایسے چپکے تھے جیسے غریب سے دُکھ چپٹے ہوتے ہیں ......لوگ غٹا غٹ ٹھنڈا پانی اور مشروبات اپنے حلقوم سے نیچے انڈیلتے ......مگر پیاس کی شدت کچھ ہی دیر بعد پھر سے ہلکان کرنے لگتی ......پختہ گلیاں اپنے اندر کا کرب باہر نکال رہی تھیں ......مکھیوں ......مچھروں نے کھانے پینے کی اشیاء پر اپنی حکمرانی جما رکھی تھی ......آسمان اپنے نیلے رنگ کے ساتھ سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا......اُس نے اپنے اُوپر سے سفید اور کالی اوڑھنی اتار پھینکی تھی ......نجانے برف اور بارش اُس کے خیالات پہ کیوں دستک دینے لگی۔

گاؤں کی پہاڑی پر برف کی جمی موٹی تہہ......سرسر کرتی ہوا......پرندوں کا اپنے گھونسلوں میں دُبکنا......تیز بارش کا کبھی اُوپر تو کبھی نیچے چہل قدمی کرنا ......درختوں کی ننگی ٹہنیوں کا خوشی سے جھوم جھوم کر نہانا ......سامنے والے پرنالے کا شور مچانا......ندی کا آپے سے باہر ہو کر چھلانگیں لگانا ......لکڑیوں کا تڑتڑ کر کے جلنا......انگاروں کا اُچھل اُچھل کر اِدھر اُدھر بھاگنا۔ آگ کے گرد دائرے میں بیٹھے ......مرد عورتیں ......بوڑھے بچے ......کبھی اپنے پاؤں تو کبھی اپنے ہاتھوں کو گرم کئے جا رہے تھے ......بارش میں بھیگ جانے والی بکریاں کونے میں معصومیت سے آنکھیں جھپک رہی تھیں ......بچے بوریت کے شکار...... برف میں کھیلنے کے آرزومند تھے...... جنھیں سختی سے منع کر دیا گیا تھا......مگر بچے کب کسی کی سنتے ہیں ۔وہ برف میں مارا ماری کرنے لگے کوئی یہاں گرا تو کوئی وہاں پھسلا ......کوئی رونے لگا تو کوئی اُس پہ ہنسنے لگا ......گرمی میں برف پہ لکھا جائے تو پڑھنے والے کو راحت مل سکتی ہے ......مگر یہ کوئی نئی کہانی تو نہیں ہوگی، جو پڑھتے ہی دل میں اُترے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے۔مجھے کمزور لوگوں کے مسائل پہ لکھنا چاہیئے یا پھر طاقتور ممالک کے مظالم کو کھول کھول کر سامنے لانا چاہیئے ۔بچے بھوک سے بلک رہے ہیں کچھ تو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ دِکھ رہے ہیں ......غذائی قلت نے سب کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے انسانیت کہاں ہے ......؟؟؟شاید سب پر غنودگی چھائی ہوئی ہے ......وہ جو سہانے خواب دکھا رہے ہیں ......جو کبھی انصاف کے نام پہ کبھی تبدیلی کا کہہ کر......کبھی حقوق دِلوانے کی خاطر......ہمیں ہانکے پکارے جا رہے ہیں ......اور ہم اپنا خون پی کر کبھی ایک جگہ جا اُچھلتے ہیں تو کبھی دوسری جگہ جا کودتے ہیں ......وہ ہمیں اِس حالت میں دیکھ کر محظوظ تو ہوتے ہوں گے ...... مجھے اُن پر لکھنا چاہیئے

۔مگر......اُن پر تو صدیوں سے کاغذ کے پلندے کالے کئے جا چکے ہیں ۔نہیں !ہرگز نہیں !!کبھی نہیں !!!میں پرانی گھسی پٹی کوئی کہانی نہیں لکھوں گا ۔میں نے نئی کہانی لکھنی ہے، جو پڑھتے ہی دِل میں اترے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے۔

کیا مجھے آسودگی دینے والی کہانی لکھنی چاہئے جس سے کچھ وقت کے لئے ہی سہی پر سکون تو ملے ۔جو زخموں پہ پھاہا کا کام کرے۔جس سے خوشی اور شادمانی میسر ہو جو ۔وجود میں پھیلے اضطراب کو مُندمل کرے اور راحت کا سامان پہنچاتے ہوئے لذت سے ہمکنار کرے ......اُسے کئی نقادوں اور لکھاریوں کے الفاظ یاد آنے لگے ......اسے اپنے ایک مداح کا کچھ عرصہ پہلے خط موصول ہوا تھا جس میں لکھا تھا کہ آپ موجودہ دَور کی عکاسی کرنے والے کہانی کار ہیں ......ایک اور نے تو یہ بھی کہا تھا ......آپ کی کہانی مختصر ہوتی ہے جس سے سارا مزا کرکرا سا ہو جاتا ہے ......ایک دوست نے اپنی رائے میں کہا تھا کہ آپ کی کہانی اپنا دائرہ تو پورا کرتی ہے پر جدت سے ہمکنار ہونا اِس کے بس کی بات نہیں ......ایک اور کا مشورہ تھا ......کہانی لمبی لکھا کرو ......کسی دوسرے نے بتایا تھا ......جناب مجھے تو مختصر کہانیاں ہی پسند ہیں ......ایک تقریب میں اِس موضوع پر بات چلی تھی کہ آپ کی کہانیاں وقت کی کہانیاں ہیں ......اِس بات نے اسے کافی عرصہ تک مخمصے میں ڈالے رکھا ......وقت !کون سا وقت ......؟؟؟ جو گزر چکا؟ جو گزر رہا ہے؟؟ یا جو ابھی گزرے گا؟؟؟ چھوڑو میں کن خیالات میں جا پھنسا ......اُس نے سر کو جھٹکا ۔میں نے تو کہانی لکھنی ہے ......ایسی کہانی جو پڑھتے ہی دِل میں اترے اور دماغ میں ہلچل سی مچا دے۔

پہلا جملہ کیا ہونا چاہئے؟ جو پڑھنے والے کو دِل تھامنے پر مجبور کر دے ......ہاں !یہ جملہ مناسب رہے گا ......"جو مل نہ سکے اُس کا انتظار کیوں؟؟؟" ......نہیں ......یہ جملہ اِس طرح ہو ......"جو حاصل ہی نہیں ہو سکتا اُس کی جستجو کیسی ......؟؟؟" ......بھلا یہ بھی کوئی جملہ ہے ......جو حاصل ہی نہیں ہو سکتا اُس کی جستجو کیسی؟ کوئی اور جملہ ہونا چاہئے ......جو پڑھتے ہی قاری کو اپنے حصار میں لے لے ......پھر اُس نے صفحات کو سمیٹا اور ہم کلامی کرنے لگا۔

جہاں محسوسات، احساسات اور خیالات کی کوئی قدر نہ ہو ......جہاں علمی خزینے ردی کی طرح فٹ پاتھوں پہ دُھول پھانک رہے ہوں ......جہاں لفظوں کے کاریگر پاگل تصور کئے جاتے ہوں ......جہاں انسان منڈی کی اشیاء کی طرح مایا کے ترازو میں تولا جائے ......جہاں

مذہب کے نام پر گردنیں کاٹی جائیں ......جہاں انسانی زندگی کی کوئی قدر نہ ہو...... جہاں اللہ کے نام پر دھوکا دیا جاتا ہو......جہاں روٹی کیلئے عصمتیں نیلام ہوتی ہوں...... جہاں جھوٹ ،منافقت،دروغ گوئی اور چرب زبانی کو سیاست کہا جاتا ہو ...... جہاں ایک جیسے شہریوں کیلئے قانون میں تفریق ہو...... جہاں حق والوں کو خفت اٹھانی پڑے ...... جہاں مجرم سرعام دندناتے پھرتے ہوں ......جہاں مظلوم پہ ہی ظلم روا رکھا جائے ...... جہاں رشتے معیار کی بھینٹ چڑھتے ہوں......جہاں سچ منہ چھپائے اور جھوٹ بغلیں بجائے ...... کیاوہاں کہانی کا لکھنا ضروری ہے......؟؟؟

میرا وہ دوست ٹھیک ہی کہتا تھا......تم پاگل ہو......لفظوں کے گورکھ دھندے اور خیال کی دنیا میں پھنس کر قدم قدم پہ تھپیڑے کھائے جا رہے ہو"......اُس نے یہ بھی تو کہا تھا......

جہاں احساسات کو محسوس کرنے کی حس ختم ہو جائے ......

جہاں خیال کو سمجھنے والا کوئی نہ ہو......

جہاں خیال کی کوئی قدر نہ ہو......

وہاں خیال کو لفظوں کا پیرہن پہنا کر تحریر تو کیا جا سکتا ہے مگر اس تحریر سے تحریک پیدا نہیں کی جا سکتی"......

ہاں!وہ سچ کہتا تھا......

پر نہیں ......شاید......وہ......

ابھی تک لفظوں کی طاقت اور خیال کی قوت سے نا آشنا تھا۔

کتمان

مشکل وقت میں بھی اُس کے چہرے کی ہشاشیت اور سکون دِل کے ٹھہراؤ کی غمازی کر
تا ......اتنا ٹھہراؤ اِس دُور میں بھلا کہاں ......؟؟
وہ باتیں بہت کم کرتا جب کوئی بات پوچھی جاتی تو کافی دیر سوچنے کے بعد جواب دیتا......سوچ
بارے استفسار کیا جاتا تو کہتا انسان جلد باز ہے جو منہ میں آئے کہہ دیتا ہے لہذا بات کرنے سے
قبل خوب سوچ لینا چاہئے ......کبھی کبھی تو اُس پر کسی فلسفی کا گمان ہونے لگتا......جو ہر وقت کچھ نہ
کچھ سوچنے کے عمل میں سرگرداں رہتا۔
وہ آنکھیں بند کر کے اپنے وجود کو منظم کرتا، پھر ذہن کو ایک نقطے پر مجتمع کر کے بکھری
سوچوں کو یکجا کر لیتا ......کبھی تو یہ لمحات اُس کی رُوح میں تازگی بھر دیتے اور کبھی وہ ایک دَم سے بکھر
سا جاتا ......وہ اِن لمحات میں کئی خواب حقیقت کے روپ میں دیکھتا تھا ......کئی جہگوں کی سیر کو جا
نکلتا کئی بار وہ وہاں سے ہو آتا جہاں عام طور پر جانا ناممکن ہے۔
وہ کس کس جگہ جاتا یہ اُس کی سوچ پہ منحصر تھا۔
شائد اُس نے اپنے باطن میں ایک وسیع دنیا بسا رکھی تھی ......وہ کہتا تھا کہ اُس نے وہ
مرد بڑے قریب سے دیکھے ہیں جو زرق برق لباس زیب تن کئے مٹک مٹک کے چلتے تھے ......
وہ اُن لوگوں کی بابت بھی باتیں کرتا تھا جو بلندی پہ رہنا پسند کرتے تھے اور نیچے آنا اپنی

توہین سمجھتے تھے۔

اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس نے ایک جانب سے بلند ہوتی مٹھڑ یاں بھی سنی جب وہاں دیکھا تو وہ جوان اور عمر رسیدہ عورتوں اور مردوں کا جم گھٹا تھا جو کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر بھاگے جا رہے تھے ان کے گلے سے نکلتی آوازوں میں عجیب سی وحشت تھی ......وہ کس سے بھاگ رہے تھے ......کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اُس نے وہ عورتیں بھی دیکھیں جو بہت خوبصورت تھیں جن کو دیکھ کر اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہوتا مگر وہ اُن کے ظاہر سے زیادہ اُن کے باطن کی سیر کرتا۔

باطن میں چھپی ہر شے اس کے سامنے آجاتی اُن کا ظاہر بھی اِس قابل تھا کہ اُن کو چھو کر اطمینان حاصل کیا جا سکتا تھا۔

خمار سے بھری بڑی بڑی آنکھیں، لمبی لمبی زلفوں میں سفید گول مکھن کے پیڑے کی مانند چہرہ، سڈول جسم، جذبات کو ارتعاش دیتے اور چھو لینے پہ اُکساتے ......جب بھی اُس کا ارادہ بنتا تو نجانے کیوں اُسے سرانڈ سی آنے لگتی......چاروں اور عجیب سی بدبو پھیل جاتی ......اُسے اُن عورتوں کے جسم پہ عجیب نشانات دکھائی دیتے جن سے مسلسل کچھ بہہ رہا ہوتا ......اِس بہاؤ میں تسلسل ہوتا جوڑ کنے کو نہ آتا۔

یہ کیا ہو سکتا ہے؟؟ وہ اکثر خود سے سوال کرتا۔

اُس سے سامنے کھڑی عورت کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں وہ خود کو نادم سا محسوس کرنے لگتی۔

اُس کے سامنے کھڑی عورت نے اُس کی چہرے پہ نظریں گاڑھتے ہوئے کہا......کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟؟؟؟ تم بہت خوبصورت ہو......اس نے کٹیلے انداز میں جواب دیا۔

اور میرا جسم؟؟؟......تمھارا جسم اِس قابل ہے کہ......؟؟؟ جواب سن کر عورت کے چہرے پہ تازگی اور لبوں پہ تبسم سا پھیل گیا۔

تو پھر میری خوبصورتی دیکھو اُس نے اپنا آپ عیاں کر دیا ......واقعی وہ بے حد خوبصورت تھی۔

اچانک اُسے تعفن سا اُٹھتا محسوس ہوا جس سے اُس کی طبعیت متلانے لگی۔

عورت اُس کے قریب ہوئی اُس کا سانس لینا محال ہونے لگا اتنی سرانڈ...... اُسے ابکائیاں آنے کو تھیں۔

کیوں کیا ہوا؟؟؟ وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مس کرنے کی کوشش میں تھی......وہ مسحور کن کیفیت کی گرفت میں اپنی گرم سانسوں کو محسوس کر رہی تھی ......نمکین اور میٹھی لذت اُس کے جسم میں لہر کی مانند کوند رہی تھی ......شوخی و مستی، شگفتگی وشادمانی، اسکی چال ڈھال سے ٹپک رہی تھی۔

نہیں کرو......اس نے بےزاری سے کہا۔

کیوں کیا ہوا......؟؟؟ وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

میری طبیعت خراب ہو رہی ہے تم مجھ سے دُور ہو جاؤ......وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔

پر......؟؟؟ ......ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا پھر آج ایسا کیوں؟؟ اُسنے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

پہلے کب میں تو تمھیں آج ہی مل رہا ہوں ......وہ اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

تم مجھے مسلسل ملتے رہے ہو......کیا کوئی اتنی جلدی بھول بھی سکتا ہے ......؟؟؟ اب کہ وہ ناراض تھی۔

مگر مجھے یاد نہیں وہ دماغ پہ زور دے کر سوچنے لگا۔

ہاں ......اب تم کو کیسے یاد آؤں تم مردوں کی عادت ہے ......کھایا پیا اور بھول گئے۔

مگر......؟؟ ......چھوڑو......اگر مگر کو......وہ بےزاری سے کہنے لگی۔

وہ اُسے بھینچنا چاہتی تھی مگر وہ دُور ہو رہا تھا......دُور کیوں ہو رہے ہو......وہ اُس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے پوچھنے لگی۔

کیا تم مجھ سے حظ نہیں اٹھانا چاہتے ......؟؟؟ ......نہیں نہیں ......وہ قدرے دُور ہٹنے لگا۔

مگر کیوں مجھے تمھاری ضرورت ہے ......اُس نے زبردستی اُسے دبوچ لیا عجیب سی بو اسکی طبیعت اُچاٹ کر گئی......اچانک کچھ دیر پہلے کا کھایا پیا اُمڈ کے سامنے بکھر گیا۔

عورت کے جسم کی سرانڈھتنوں سے جسم کے اندر سرایت کر چکی تھی۔
اُسے اپنے آپ سے عجیب سا تعفن اٹھتا محسوس ہوا جو طبیعت پہ گراں گزر رہا تھا......وہ خود کو ٹٹولنے لگا اُسے لگا ...... پیلا سیاہی مائل مادہ اس کے اندر سے اُبلنے کو ہے۔
اُس مادے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ وہ مسلسل الٹیاں کرنے لگا ...... جب وہ قدرے دُور ہوا اُس نے دیکھا کہ ویسا ہی پیلا سیاہی مائل مادہ اُس عورت کے جسم سے بھی بہہ رہا ہے......وہ وہاں سے بھاگنے کی سعی کرنے لگا ......عورت اس کو یوں چھوڑ جانے پہ کوسنے لگی۔
اُس نے اپنی آنکھیں کھول لیں اُس کو لگا کہ اس کے چہرے کے خط وخال میں کسا وُ در آیا ہے۔
وہ اِس بارے سوچنے لگا کہ اِس دنیا کہ باسی کس طرح یہ وقت گزارتے ہوں گے۔لمحہ لمحہ غلاظت،سرانڈ اور تعفن اُن کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہے۔
وہ اُس وقت کو بھول جانا چاہتا تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی لمحے اُسے یاد آتی تو سانس اُکھڑ سی جاتی۔
سنی سنائی بات اور اصل میں کتنا فرق ہوتا ہے۔
لوگ بھی بس جب رائے دینے پہ آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے وہ ظاہر دیکھ کر رائے دینے میں حق بجانب ہیں ......بھلا وہ باطن میں اتر بھی کب سکتے ہیں ...... میں اِن جاہل لوگوں کی باتوں پر کیونکر اعتبار کروں جن کو حقائق کا کوئی علم نہیں ......وہ حقائق کی تلاش میں اپنے اندر کود گیا۔
اُس نے خود کو کسی ندی کے کنارے کھڑا پایا ......ندی کا پانی اپنے اندر عجیب سحر رکھتا تھا۔
وہ ندی کے سحر میں طمانیت محسوس کرنے لگا......وہ اُن شہروں کو بھی دیکھنے لگا تھا جہاں اب صرف پانی کا راج ہے۔
لوگ سمجھتے ہیں یہاں پانی ہی تھا......وہ نہیں جانتے کہ یہاں کسی وقت بہت بڑی آبادی رہائش پزیر تھی۔
اونچے مکان،کشادہ گلیاں ......بڑے بازار،چوبارے ......باغ اور لہلہاتے کھیت تھے۔

پڑھے لکھے اپنے علم پہ نازاں، ہنرمند اپنے ہنر پہ مغرور، فن کار اپنے فن میں یکتا......لوگوں کی کثیر آبادی موجود تھی...... یہاں بسنے والوں میں قد آور، طاقتور، نامی جنگجو بھی تھے۔

خوبصورت لڑکیوں اور عورتیں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔

وہ پہاڑی کے وسط میں کھڑا ٹہل رہا تھا......اب جہاں وہ جا کر کھڑا ہوا سارا شہر اُسے پاؤں میں دِکھنے لگا...... پشت کی جانب مڑ کے جو دیکھا تو خوبصورت حویلیاں اور جیسم کی سلوں سے بنے کشادہ رستے موجود تھے...... سامنے شاندار مسجد تھی......مگر اُتنی نہیں......جتنی کہ پہاڑی کی چوٹی کی مسجد شاندار دِکھائی دے رہی تھی......اُس میں عجیب کشش تھی......اُس نے ظہر کی نماز وہاں پڑھنے کا قصد کیا۔

ایک جانب بیٹھی لڑکی کھانا بنا رہی تھی یہ لڑکی کون ہے......؟؟؟ وہ اُسے مخاطب کرنا ہی چاہ رہا تھا......کہ وہ کہنے لگی......صاحب کھانا تیار ہو چکا......لگا دوں؟؟؟

اُس نے نماز ادا کرنے کے بعد کھانا کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

وہ دھیرے دھیرے پہاڑ کی جانب بڑھنے لگا تو لڑکی نے صدا دی......صاحب آپ اُدھر نہ جائیں......وہ اُس کی بات سے قطعی حیران نہیں ہوا کیونکہ وہ سمجھا شاید لڑکی کھانے کی بابت پریشان ہے......مسجد قدرے دُور ہے اور کھانا ٹھنڈا ہو سکتا ہے...... وہ اُسے ہاتھ کے اشارے سے انتظار کا کہتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر مسجد کی جانب چل پڑا۔

فلک بوس عمارتیں پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں......سامنے پہاڑی سیدھی آسمان کی سمت یوں اُٹھی ہوئی تھی جیسے اِس پہاڑی کو بھی تراش کر آسمان کی سمت بلند کیا گیا ہو...... پہاڑی پر گھنے درخت، درختوں کے درمیان سے گزرتی چھوٹی سی آبجو جو سامنے کی آبشار کے پانی کے پرشور دھانے سے نکل رہی تھی......آبشار جہاں گر رہی تھی وہاں ایک وسیع وعریض علاقے میں جھیل بن چکی تھی اور جھیل کے پانی میں کشتیاں چل رہی تھیں......قدیم طرز کا شہر دیوہیکل پتھروں کو تراش کر بنائی گئی عمارتیں اور کشادہ رستے......وہ سوچنے لگا کن ہاتھوں نے کشیدہ کاری کی ہوگی......کس جگر کاوی نے یہ کام سرانجام دیا ہوگا......وہ حیرت اور استعجاب کی کیفیت میں مبتلا تھا......سامنے والی عمارت پہ پھولوں کی کشیدہ کاری کی گئی تھی اس عمارت کیساتھ غالب کاری اپنی مثال آپ تھی۔

اکثر عمارتیں دومنزلہ تھیں مگر سہ منزلہ، چارمنزلہ عمارتیں بھی کچھ کم نہ تھیں جن پہ خوبصورت محرابوں سے مزیّن صناعی کے لاجواب نمونے اُن کی دلکشی میں اضافہ کررہے تھے۔

جس عمارت پہ بھی نظر ٹکتی وہ حیرانگی میں غرق ہوجاتا ......وہ جس سیڑھی پر بھی قدم رکھتا تو تین چار ڈگ بھر کے دوسرے زینے پر چڑھ پاتا ......اتنی چوڑی اور لمبی سیڑھیاں اُس نے پہلی بار دیکھی تھیں ......ہر زینے کے ایک جانب کیاری بھی موجود تھی جس میں مختلف رنگوں کے سرخ، سفید، کالے، پیلے پھول کھلے ہوئے تھے ......عمارتوں کو نفیس اور شاندار طریقے سے تعمیر کیا گیا تھا......وہ چلتے چلتے مسجد کے صدر دروازے پر جا پہنچا......اتنا بڑا دروازہ،اس پر خوبصورت نقش نگاری اور قرآنی آیات کی مختلف رنگوں اور رسم الخطوں میں خطاطی اس کی نظروں کو خیرہ کئے جارہی تھی ......مسجد کے دروازے پر بڑا سا قفل پڑا تھا......یہ دیکھ کر مسجد کے اندر نماز پڑھنے کی خواہش دَم توڑ گئی......وہ مسجد کے دروازے پر پڑے قفل کے سائز اور ہیئت کے بارے میں سوچنے لگا کہ اتنا بڑا قفل کب، کہاں اور کس نے بنایا ہوگا ؟؟؟

کونسی فیکٹری یا کارخانہ اتنے بڑے قفل بناتا ہے......یہ تو بے حد مہنگا ہوگا......جب اُس نے قفل کو چھوا ......سردی کی ایک شدید لہر اس کے جسم میں کوندگئی۔

اُسے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی......اِس قدر ٹھنڈا تالا جیسے اس کی انگلیاں برف میں ڈال دی گئی ہوں ......اُس نے پھر سے قفل کو چھوا......تو حیرانگی میں اور بھی اضافہ ہوا۔

قفل پتھر کا بنا ہوا تھا ......پتھر کی اتنی شاندار کٹائی......کس نے کی ہوگی۔

ایک مدت گزرنے کے باوجود بھی اپنی اصل صورت میں ......صاف شفاف اور مضبوط ......قفل پر کندہ نقش ونگار خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے۔

وہ دروازے کو دیکھنے لگا جو ضخامت اور اونچائی میں کسی قلعے کے مشابہہ تھا نماز ادا کرنے کی خواہش دِل میں لئے لوٹ آیا......راستے میں سوچنے لگا جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے ویران ہوجائیں تو سمجھ لو کہ عوام دنیاداری کی اعلیٰ سطح پر جا پہنچی ہے۔

لڑکی کھانا لگائے اُس کا انتظار کررہی تھی......اُس نے کھانا کھاتے ہوئے شہر کی بابت سوال کیا تو وہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔

اُس لمحے اس کی آنکھوں سے انسیت ٹپک رہی تھی وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ بن

نہیں پا رہے تھے۔

جب اُس نے کہنا شروع کیا تو الفاظ اُس کی آنکھوں کے برخلاف جملوں کی ادائیگی کئے جا رہے تھے......شائد وہ کچھ چھپانا چاہتی تھی مگر چھپا نہیں پا رہی تھی۔

اس نے دانستہ گفتگو کا موضوع بدلا اور اُس کی خانگی زندگی بارے پوچھنے لگا۔

اُس نے بتایا کہ اس کے دو بچے ہیں اور خاوند شہر کام پہ گیا ہوا ہے مگر عرصے سے واپس نہیں لوٹا اب اس کا گھر ایک سرائے کی حیثیت رکھتا ہے اس علاقے میں سیر کے لئے آنے والے کچھ دن یہاں بھی قیام کیلئے آ جاتے ہیں اس طرح اُسے کچھ پیسے مل جاتے ہیں جس سے اس کی گزراوقات اچھی ہو جاتی ہے۔

وہ لفظ مٹھار مٹھار کر باتیں کر رہی تھی شائد کہیں دُور کسی خیال کے زیرِ اثر گم تھی۔

ہم نے ساتھ میں پانچ سال گزارے......خوب گھومے پھرے......کھایا پیا......موج مستی کی......جو لمحات گزارے پر لطف انداز میں گزارے۔

اِسی دوران میری بیٹی اور بیٹا ہماری زندگیوں میں ہوا کے تازہ جھونکوں کی طرح وارد ہوئے......مگر پھر میرا خاوند مجھ سے بیزار سا رہنے لگا......اُسے میری وہ باتیں جو کبھی بہت پسند تھیں اب ناپسند لگنے لگیں......مگر میں اس کے رویے کو بھانپ کر بھی نبھا کئے جا رہی تھی۔

شاید میں اس کی محبت میں گرفتار تھی......محبت سے کیا مراد ہے تمھاری؟؟ اُس نے اچانک ٹوکتے ہوئے محبت بارے پوچھا۔

صاحب محبت سے بھلا کیا مراد ہوتا ہے......محبت تو محبت ہوتی ہے......وہ اچانک سوال سے کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

تم جس کو محبت کہتی ہو......کیا وہ اپنے مفادات کے حصول یا تسکین پانے کے اتفاق کا نام نہیں......؟؟؟ وہ اُس لمحے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

نہیں صاحب......مجھے واقعی اُس سے محبت تھی اور......شائد......اب بھی ہے......وہ یہ کہتے ہوئے کچھ سوچ بھی رہی تھی............شائد......اگر......مگر......جہاں آ جائیں......کیا وہاں شک نہیں پایا جاتا......؟؟؟

شک......کیسا شک......وہ بے ساختہ کہنے لگی۔

صاحب اب وہ عرصے سے نہیں آیا ...... پہلے پہل تو وہ ہفتہ دو ہفتے بعد آجاتا تھا مگر اب ......اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ......اُس کے لہجے سے افسردگی عیاں ہو رہی تھی ۔

وہ اُسے دیکھ کر سوچنے لگا کہ اتنی خوبصورت اور سگھڑ لڑکی سے بے اعتنائی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ......وہ اِس بارے سوچ ہی رہا تھا ۔

وہ کہنے لگی ......سنا ہے اُسے کوئی کنواری مل چکی شائد اِس وجہ سے وہ اب گھر نہیں آتا ۔

تو کہاں گئی تم دونوں کی محبت ......سوال سن کر وہ کچھ تذبذب کا شکار ہی ہو گئی ۔

صاحب محبت تو ہوتی ہے ......کیا ہوتی ہے؟؟؟ وہ اُسے کریدتے ہوئے پوچھنے لگا ۔صاحب یہ محسوسات اور احساسات کا نام ہے ......جو شائد لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے ......تمھارا خاوند جس سے شائد تم ابھی بھی محبت کا دَم بھر رہی ہو ......کیا واقعی تمھیں اُس سے محبت ہے ......؟؟؟

تم جیسی سگھڑ ،خوبصورت اور جوان لڑکی کو چھوڑ کے نجانے کہاں چلا گیا ......کیوں چلا گیا ......؟؟؟ تمھیں اُس کی ضرورت تھی اور ہے اور وہ؟؟؟

بس کرو صاحب میرا مزاق نہ اڑاؤ ......میرے زخموں پہ نمک نہ چھڑکو ......وہ دلبرداشتہ سی دکھنے لگی ۔

مزید جاننے کی خواہش دم توڑ چکی تھی ......وہ مزید بات کرنے سے اجتناب جو برتنے لگی تھی ......

کھانے کے بعد وہ دریا کی سیر کو نکل گئے ......دریا کے پاٹ کے ساتھ ساتھ لکڑی کے بنے ہوٹلوں میں دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کی بھرمار تھی اور دریا کی پرشور لہریں ایک عجیب قسم کا سحر پیش کیے جا رہی تھیں ......لکڑی کے ہچکولے کھاتے پل پر گزرتے ہوئے ایک خوف سا پیدا ہوتا تھا ۔

وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ پل پار کر کے دوسری جانب جائے مگر اس وقت اس کے اندر ایک عجیب قسم کا خوف سرایت کر چکا تھا ......لڑکی نے مسکراتے ہوئے اُس کی جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا مگر اس نے اپنے سر کو انکار کی صورت ہلکا سا گھمایا ......وہ زیرِ لب مسکرانے لگی ......اُس کی مسکراہٹ میں عجیب سحر تھا ......شاید وہ اس کی بزدلی پر مسکرا رہی تھی یا بچوں کی طرح اس پر طاری خوف کو بھانپ چکی تھی ......دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے ......وہاں پانی اتنا

شفاف تھا کہ اس کی تہہ تک آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا...... اتنا شفاف پانی اُس نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا...... تھوڑا آگے جہاں پانی کی سطح قدرے کم تھی کچھ لوگ پانی میں نہا رہے تھے...... وہ اُسے پانی میں جانے کا کہنے لگی مگر اُس نے انکار کر دیا۔

اُس پر خوف کی کیفیت بدستور طاری تھی...... جس سے وہ باہر نہیں نکل پا رہا تھا...... وہ اُس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی...... پھر وہ اس مقام تک جا پہنچے جہاں سے ایک انتہائی نازک پشتے پر چند قدم چل کر دوسری جانب جانا تھا...... وہ اُسے دوسری جانب کی تفصیلات بتانے لگی کہ وہاں دنیا کے نامور سپہ سالاروں، حکمرانوں اور بادشاہوں کے لباس اور ان کے زیرِ استعمال مختلف قسم کے نوادرات پڑے ہیں۔

چلو اُدھر چلتے ہیں...... مگر وہ اُس راستے کو دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو گیا...... اب کی بار وہ غور سے دیکھتے ہوئے قائل کرنے لگی تھی کہ سب لوگ تو جا رہے ہیں۔

پھر ڈر کیسا...... مگر سب لوگ تو اس کے لئے اجنبی تھے...... وہ تو اس بھیڑ میں صرف اُسے ہی جانتا تھا۔

اُس سے بات کر سکتا تھا اُپنے محسوسات اور احساسات سے آگاہ کر سکتا تھا...... نجانے کیوں اُس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک سرشاری سی وجود میں محسوس کر رہا تھا۔

وہ دریا سے کنی کترا رہا تھا پھر اُس کے بار بار کہنے پر دریا کے پانی پر نظر دوڑائی۔

دریا کے پانی پر سورج کی پڑتی چمکتی شعاؤں سے قوسِ قزح کے جیسے رنگ چار سو پھیل رہے تھے...... وہ دریا کے پانی کی شفافیت سے تحیر میں مبتلا ہو گیا تھا...... پانی پہ نظر پڑنے سے جسم میں عجیب سا سکون اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی کوندگئی...... جس سے طبعیت نہال سی ہونے لگتی...... کچھ آگے بڑھے تو سارا سحر ٹوٹ گیا...... اندھیرا ہی اندھیرا...... سیاہ رنگ کا پانی اپنی شفافیت کھو کر تعفن پھیلا رہا تھا ایسے لگتا اس میں بہت سے مردار جانور پڑے ہیں۔

ایسا پانی اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ایسی بدبو کبھی سونگھی تھی...... وہ اس پانی بارے پوچھنے لگا...... لڑکی نے لمبا سانس لیا اور کہنے لگی کہ یہ پانی بھی صاف شفاف تھا مگر لوگوں کی وجہ سے گدلا ہو گیا۔

لوگوں کی وجہ سے......؟؟؟...... وہ کچھ سمجھ نہ سکا تو پھر سوال دُھرا دیا۔

ہاں لوگوں کی وجہ سے ......مگر کیسے......؟؟؟

جولوگ اپنے شفاف جسموں کو سیال گندے مادوں سے بھر دیتے ہیں اُن کے جسموں کی اندر کی غلاظت، باہر کی گندگی، پیپ اور پھوڑے یہاں دھوئے جاتے ہیں......وہ میل اور جسم کی کثافت مردار جانوروں کی صورت اختیار کر جاتی ہے...... یہ پانی اُن کی غلاظتوں کو دُھو کر پھر سے صاف، شفاف بنا دیتا ہے......کبھی یہ پانی بھی شفافیت میں اپنی مثال آپ تھا......اب اِس میں غلاظتیں در آئی ہیں آلودگی سے اصلیت کھو چکا......تبھی تو تعفن کا سبب بن رہا ہے۔

اُسنے غور سے دیکھا تو اُسے بہت سے گدھے، گدھ، گھوڑے، گیدڑ، کوے چمگادڑیں، سانڈ، سور، چوہے، بلیاں، اور کتے پانی میں تیرتے نظر آئے۔ اُسے سخت گھٹن محسوس ہونے لگی......سانسوں کا جاری رکھنا محال ہونے لگا تھا......طبیعت متلانے لگی......ابکائیاں آنے کو تھیں......دماغ میں ہلچل سی مچ چکی تھی......اُسکی آنکھیں بند ہو رہی تھیں......وہ گرنے کو تھا......اُس نے اپنا آپ سنبھالا......زُور دے کر آنکھیں کھولیں......نظر سامنے چشمے پہ جا ٹکی......لڑکیاں گاگریں، گھڑے اور بالٹیاں قطار میں رکھے باری کے انتظار میں کھڑی آپس میں باتیں کر رہی تھیں......صاف ستھرا پانی دیکھ کر سرشاری وجود میں سرایت کر گئی......مشرق سے سورج اپنی روشنی چاروں اور بکھیرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

وی

حالات اِس قدر بدل چکے تھے کہ اب ہر کوئی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا...... مختلف شہروں میں پے در پے دھماکوں نے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا...... پڑوسی ممالک بھی اپنے مفادات کی تکمیل کی خاطر ملکی حالات پہ اثرات مرتب کر رہے تھے......ایک جانب کی محفوظ سرحد بھی غیر محفوظ ہو چکی تھی ......کئی اپنے ،دشمن ممالک کے ہاتھوں میں کھلونوں کا کام بھی سر انجام دے رہے تھے......مسالک جو پہلے اندر ہی اندر ایک دوسرے کو کاٹے جا رہے تھے اب کھل کر سامنے لڑ رہے تھے کوئی کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔

سیاست میں بھی عدم برداشت کا عنصر دَر آیا تھا......کئی سیاسی پارٹیوں کے کارکن ایک دوسرے کے سر کھول چکے تھے۔

اب تو یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ سیاسی پارٹیوں کے باقاعدہ ونگ ترتیب دیئے جا چکے جو مخالف سیاسی پارٹی کے سرگرم عہدیداران اور کارکنان کو کسی بھی جگہ کسی بھی وقت نشانِ عبرت بنا سکتے ہیں۔

ہر طرف یاسیت اور نا امیدی پھیل رہی تھی ......سوچیں کسی انجانے خلجان کا شکار ہوئے جا رہی تھیں ......کس لمحے کیا ہو جائے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

ٹی وی چینل اپنی دَوڑ میں لگے تھے......ایک کہتا سب سے پہلے یہ خبر ہم لائے تو دوسرا کہتا یہ خبر سب سے پہلے صرف ہم نے آن ایئر کی ......اِن کی اس دوڑ سے قطعاً نہیں لگ رہا تھا کہ اُن کو ملک کی یا اِس ملک میں رہنے والوں کی کوئی فکر ہے ......بس اپنی خبر کی فکر میں سرگرداں تھے۔

کبھی ایک سیاسی پارٹی کے ذِمہ دار کو براہ راست لیا جاتا تو کبھی دوسری پارٹی کے عہدیدار پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی جاتی ......وہ اپنی گفتگو میں چرب زبانی اور جھوٹ کو اِس طرح ملا جلا کر پیش کرتے کی محسوس ہونے لگتا کہ اگلے ہی لمحے سب ٹھیک ہو جائے گا ......وہ جمہوریت کے وسیع تر مفاد کو مقدم رکھتے ہوئے مل جل کر کام کرنے پہ زور دیتے اور انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا کرنیکا عہد کرتے۔

یہی حالات اگر کسی مذہبی جماعت کے ساتھ پیش آ جاتے تو مذہبی قائدین سے دِین اسلام اور ملکی سلامتی پر سوالات پوچھے جاتے۔ جواباً وہ اسلام کی خاطر لچھے دار دروغ گوئی کرتے ہوئے الفاظ کو مٹھار مٹھار کر بیان کرتے اور کارکنان کو صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے کہ اِس وقت ہمیں اسلام کی بقا اور ملکی سلامتی کے پیش نظر اُخوت، بھائی چارے اور اَمن کی فضا کو فروغ دے کر ملک دُشمن قوتوں کو شکست دینی ہوگی اور اسلام دشمن قوتوں کو بتانا ہوگا کہ ہم سب ایک ہیں۔

جس ملک کی سیاسی قیادت جھوٹ اور مذہبی رہنما فریب پر اُتر آئیں ......وہاں کون سا امن اور کیسی سلامتی ......یہ سارے سمجھتے ہیں کہ اِن کو دیکھنے والے اندھے اور سننے والے بہرے ہیں ......جن کے پاس سوچنے، سمجھنے کی کوئی حس نہیں ......عام آدمی بھلا ایسے حالات میں کیسے متاثر نہ ہو۔

وہ سب کیا تھا......؟؟ ......مجھے یقین نہیں آ رہا تم مجھے چھوڑ کے بھی جا سکتے ہو......وہ رُوتے ہوئے کہنے لگی۔

ارے......اِس میں رُونے کی کون سی بات ہے ......وہ اُسکی ڈھارس بندھانے لگا......

بس چھوڑو...... پکے مکان میں رہتے رہتے دِل کے بھی پکے ہو گئے ہو......اُس کے آنسو بارش کی مانند گر رہے تھے۔

اُسکی باتیں سن کے وہ بھی رنجیدہ سا ہو گیا......کب واپس آؤ گے......؟؟......اَب کے

اُسکی سانس پھولی ہوئی تھی۔

بہت جلد ......وہ اُسے چمکارتے ہوئے کہنے لگا۔

وعدہ کرو.....فرزانہ نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ہاں وعدہ ......وہ فرزانہ کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

سب ایسے ہی کہتے ہیں جو شہر کا پانی پیتا ہے بیوفا ہوجاتا ہے.....فرزانہ کے لہجے میں قدرے طنز تھا۔

مگر میں اُن میں سے تو نہیں ہوں۔

اُس نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں فرزانہ کا چہرہ بھرلیا۔

فرزانہ مستقبل کے اندیشوں میں کہیں گم سم گھوم رہی تھی وہ واپسی کے وعدے کے ساتھ شہر چلا گیا۔

عوام کی طرف سے آئے روز اخبارات کی زینت بننے والے بیان، دو کالمی، چار کالمی سرخیوں سے مزین اُسے تختہ دار پر چڑھانے کی دہائی دے رہے تھے۔

کئی لوگ بینرز اور مختلف نعروں سے مزین چارٹ لے کر سڑکوں پر بھی آ چکے تھے...... بینروں پر جلی الفاظ میں کئی رنگوں سے مزین جملے اس کو نشانِ عبرت بنانے کے لئے لکھے گئے تھے.....عدالت میں یہ کیس منفرد نوعیت اپنا چکا تھا......ورنہ یہ وہی عدالتیں تھیں جہاں کئی کیس داخل کرواتے وقت کے جوان آج بوڑھے ہو چکے تھے.....پھر وہ دِن بھی آن پہنچا جب جج نے سپاٹ لہجے میں اُس کی موت کا فیصلہ سنادیا۔

جج کا چہرہ جذبات سے عاری تھا......فیصلے کے جملوں میں اگرچہ کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا مگر الفاظ اپنے اندر ایک احساس رکھتے ہیں جن کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔

سزا کی ہولناکی ......سامنے کھڑی موت اور اُس کا انتظار کسی بھی شخص کی ذہنی حالت خراب کرسکتا ہے ......وہ اپنے خوف کو چھپانے کے لیے ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا......مگر اِس ہنسی میں بھی اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے......وہ چہرے کے خط وخال کو دانستہ بدلنے کی معصوم اور ناکام سی کوشش تو کر رہا تھا مگر اس کے چہرے کی بدلی رنگت اُس کے اندر کے کرب کو عیاں کر رہی

تھی۔

شاید فیصلہ اُس کی توقع کے خلاف تھا مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھا......وہ کمرہ عدالت میں بیٹھے شناسا چہروں کی جانب قدرے تضع سے دیکھ رہا تھا......اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے......وہ بے سدھ ہو چکا تھا......پھر ذہن پر قدرے زور دے کر اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے اچانک اس کا دایاں ہاتھ ہوا میں اُبھرا اور اُس نے دُو انگلیوں سے انگریزی کا حرف ''وی'' بنا دیا۔

صاف ظاہر تھا وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے......اور اِس کھیل میں بھی جیت اُسی کا مقدر ٹھہری ہے......مگر وہ پڑھا لکھا معقول شخص تھا اور حالات کی نزاکت سے آگاہ تھا وہ لاکھ ''وی'' کے نشان بنائے مگر وہ جان چکا تھا کہ وہ اس بھری دنیا میں چند دنوں کا مہمان ہے پھر اُس کے والدین، بہن بھائی، یار بیلی، دُنیا اور اِس کی خوبصورتیاں اُس سے اُوجھل ہو جائیں گی اور وہ منوں مٹی تلے چلا جائے گا۔

جب کمرہ عدالت سے باہر نکلا تو چند نوجوانوں نے اُس کے حق میں نعرہ بازی شروع کر دی ایک جانب سے سرخ، سفید، پیلے رنگ کی پھول کی پتیاں اُس پر نچھاور کی جانے لگیں......وہ بڑے بارعب انداز سے گاڑی کی جانب بڑھنے لگا......خصوصی فورسز کے جوانوں نے اُسے گھیرے میں لے رکھا تھا ایک جانب سے صدا بلند ہوئی یاسر صدیقی قدم بڑھاؤ ہم تمھارے ساتھ ہیں......اُس نے بڑے وقار سے اُس جانب دیکھا اور چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی......ساتھ ہی اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے ''وی'' کا نشان بنایا......اُس کے وی کے نشان کے ساتھ ہی نعرہ لگانے والوں کے جوش میں شدت آنے لگی وہ مسلسل اُچھل اُچھل کر نعرے لگانے لگے۔

اُن کے نعروں میں نجانے کیا سحر تھا کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ ایک مضبوط وجود رکھتا ہے......جسکو ختم کرنا آسان نہیں جس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جارہی ہیں جو خصوصی اہلکاروں کے سخت پہرے میں لایا اور لے جایا جاتا ہے جس کے گرد پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا سے تعلق رکھنے والے اہلکار کیمروں میں اُس کی ایک ایک ادا کو محفوظ کر رہے ہیں۔

وہ جس راہ سے چل رہا تھا اُس کو پھُولوں سے بھر دیا گیا تھا......وہ قدرے سنبھلتے

ہوئے آگے بڑھ رہا تھا ایک جانب سے کیمروں کے فلش اُس کے چہرے پر مسلسل لگ رہے تھے......اِسی دوران وہ اس گاڑی کے قریب جا پہنچا جو اُسے جیل لے جانے کے لئے کھڑی تھی اُس نے ایک قدم گاڑی میں رکھ کے پیچھے آتے جمِ غفیر پر نظر ڈالی کئی جھنڈے ہوا میں لہراتے نظر آئے......اُس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا کر پھر ''وی'' کا نشان بنایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔

وہ رات اُسکی بڑے ہی سرور میں گزری......صبح جب پہرے دار بدلا تو آنے والے پہرے دار نے اُسے بتایا کہ اس کی ''خبر'' تمام نشریاتی اداروں پر نشر کی گئی ہے اور آج کے سارے اخبار اُس کی رنگین تصویروں سے بھرے ہوئے ہیں یہ سنتے ہی وہ طمانیت محسوس کرنے لگا......ایک سرد سی لہر اُس کے وجود میں دوڑ گئی......پہرے دار نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اُس کے قائدین نے جلد ہی بڑے بازار کے چوک میں ایک بھوک ہڑتالی کیمپ بھی لگانے کا فیصلہ کیا ہے......وہ پہرے دار سے مسلسل سوالات کر رہا تھا۔

وہ مطمئن تھا اُس کے ذہن میں یہ بات پیوست ہو چکی تھی کہ وہ جلد رہا ہو جائے گا پھر اُس کا شاندار استقبال ہو گا اُسی طرح جیسے اُس کی پیشی کے موقع پر عوام نے اُس کا استقبال کیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دِن دُور نہیں جب اُسکا شاندار استقبار کیا جائے گا......پھولوں کی رنگ برنگی پتیاں اُس پر نچھاور کی جائیں گی......گلے میں مختلف رنگوں کی مالا ڈال کر بڑے جلسے کی صورت پنڈال میں لے جایا جائے گا......اُس دِن سب سے آخری عوامی خطاب بھی وہی کرے گا......پہرے دار کی باتیں سننے کے بعد اس کے دِل میں اپنے قائدین کے لئے عقیدت و احترام اور بھی بڑھ گیا......اُس کی نظروں کے سامنے قائدین کے چہرے گھومنے لگے تھے......وہ خود کلامی کرتے ہوئے کہنے لگا اُس کے قائدین اُس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں......اُس جیسا کارکن ڈھونڈنے سے نہ ملے گا وہ اپنا قد تمام کارکنوں سے اُونچا محسوس کر رہا تھا۔

اُسے وہ دِن یاد آیا جب اُس نے پہلی بار ایک فارم پُر کیا جس پر اُس کے دستخط لئے گئے اُس فارم میں لکھا تھا کہ وہ حلفیہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی پارٹی قائدین، پارٹی کے نظریات سے کبھی بھی رُوح گردانی نہیں کرے گا وہ اُن دِنوں کالج کا طالب علم تھا سیکنڈ ایئر کی کلاسیں نئی نئی شروع ہو رہی تھیں جب کالج کے فورتھ ایئر کے طالب علم نے اُس سے ایک ملاقات کی اور کہا کہ اُس کے اندر بہت صلاحتیں ہیں......بس اِن صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے......فورتھ ایئر کے

طالب علم نے اُسے بتایا کہ وہ ہیرا ہے......بس ذرہ تراش خراش کی ضرورت ہے پھر اُس ہیرے کی چمک سے سارا علاقہ جگ مگا اُٹھے گا۔

وہ پچھلی جماعتوں میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو کر یہاں تک پہنچا تھا اُس کی منزل بہت آگے تھی مگر اَب تو اُسے اپنی منزل سامنے دکھائی دینے لگی تھی کئی طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود سڑکوں پر گشت کر رہے تھے اور کئی بے روزگاری کے تھپڑوں کا شکار تھے یہ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد سے زیادہ اُونچے مقام پر فائز ہونے کو تھا......وہ اپنے کالج کے طالب علم کی باتوں سے قائل ہو چکا تھا پھر جلد ہی اُس کی ملاقات پارٹی کے اعلیٰ عہدے دار سے کروائی گئی چند فارم پُر کرنے کے بعد وہ باقاعدہ ممبر بن چکا تھا......دُوسرے دِن کی اخبارات پر صفحہء اول پر وہ پارٹی کے اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ کھڑا نظر آنے لگا......تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہو چکا تھا......کچھ مقررین کے خطاب کے بعد اُس کی کم عرصہ میں پارٹی خدمات کو زبردست الفاظ میں سراہتے ہوئے سٹیج سیکرٹری نے اُسے دعوتِ خطاب کیلئے بھرپور تالیوں میں بلایا۔

سٹیج سیکرٹری کے الفاظ اور بھرپور تالیوں مین استقبال سے وہ کچھ زیادہ ہی پُر جوش ہو گیا تھا......جلسے کے اختتام پر سب نے اُس کی شُعلہ بیانی کو بہت سراہا۔

اُسے چائے کے لیے اُس کمرے کی طرف لے جایا گیا جہاں پارٹی کیا اعلیٰ عہیداران کے لیے خصوصی لوازمات سجائے گئے تھے......پُر تکلف پارٹی کے بعد مسرور کن جذبات کے ساتھ گھر لوٹا۔

اُسے اپنے شروعات کے دِن یاد آنے لگے جب اعلیٰ عہدے دار اُسے سیاسی گُر سمجھایا کرتے تھے رات گئے جب گھر لوٹتا تو ابا اُسے سمجھاتا کہ بیٹا تمھاری منزل یہ نہیں......تو کن راستوں پہ چل نکلا ہے......یہ لوگ صرف اپنے فائدے کیلئے استعمال کرنا جانتے ہیں......تو پڑھ اوران کاموں سے دُور رہ......پھر کچھ دیر ہلکی پھلکی تو تو میں میں تکرار ہوتی۔

ابا کہتا......ارے......میرا نہیں تو اپنی ماں بہن اور چھوٹے بھائی کا ہی خیال کر لے۔ مگر وہ سنتا ہی کب تھا پھر وہ وقت بھی آیا جب اہم معاملات میں اُس کی رائے بھی لی جانے لگی......اِسی دوران واجبی سے نمبرات لے کر وہ فورتھ ایئر میں جا پہنچا مگر کئی پُر جوش جوانوں کا گروہ اُس نے اپنے گرد جمع کرلیا جو اُس کی ایک آواز پہ جان کی بازی لگانے کو تیار تھے......اُسے

باقاعدہ پارٹی کیطرف سے فنڈ بھی فراہم کیے جانے لگے...... جو بعض اوقات تفریحی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیے جاتے تھے...... وہ پارٹی مقاصد کے لیے کالج کے اساتذہ حتٰی کہ صدر معلم تک بدکلامی سے نا ہچکچاتا...... اُس کی کچھ باتیں مان بھی لی جاتی تھیں کئی مسائل کا حل اُس کی ایک فون پہ تھا جب اُس کی فون سے کام چل جاتا......

تو پارٹی ممبران فوراً حرکت میں آجاتے ہر طرف واہ واہ ہوتی اور وہ فخر سے دوستوں کے جھرمٹ میں باتیں کرتا۔

اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب وہ کالج کے تمام طلباء و طالبات سے خطاب کے دوران کہہ رہا تھا...... دوستو...... اُجالے کا تصور اندھیرے کے بغیر، میٹھے کا کڑوے اور بلندی کا پستی کے بغیر نامکمل ہے...... وہ معروف صحافیوں اور کئی مفکرین کی کوٹیشن کو اپنی تقریروں میں سمو کر ربط اور گہرائی پیدا کر کے سننے والوں سے خراجِ تحسین وصول کرتا۔

بہترین لفاظی کی وجہ سے اُس کا شمار اعلیٰ پائے کے مقررین میں ہو چکا تھا اب تو جلسوں میں اس کے نام کا ہونا ہی جلسے کی کامیابی سمجھا جانے لگا...... مخالفین کی محفلوں میں بھی اب اس کا نام سرِفہرست تھا...... ایک جلسے میں وہ مخالفین کو للکارتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے جوشیلے دوستوں کو کہہ رہا تھا...... جب بُرائی کو جڑ سے کاٹو گے تو وہ پنپ نہ پائے گی...... میرے دوستو ہم صرف شاخوں کو کاٹنے کے لئے اپنی صلاحتیں صرف کر رہے ہیں اگر بُرائی کو ختم کرنا ہے تو اُس کی جڑ کو ختم کرنا ہو گا اُس کے الفاظ سے کئی جذباتی جوان سر پہ کفن باندھ کر میدانِ عمل میں کودنے کو تیار ہو چکے تھے۔

اُسے یاد آیا...... جب اُسے اعلیٰ عہدے دار نے گرین سگنل دیا تو اُس نے اپنے کام کا آغاز اپنے ہی کالج سے شروع کیا ایک اہم مگر خفیہ میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت اُس نے خود کی تھی...... جس میں کئی معاملات زیرِ بحث آئے تھے...... دُوسرے دِن کالج کے کئی طالب علموں کے بازو ٹوٹے...... کئی سروں سے خون کے فوارے جاری ہوئے...... کالج انتظامیہ نے قریبی تھانے کو مطلع کیا...... ضلعی انتظامیہ نے واقعے کا سخت نوٹس بھی لیا تھا مگر ایک دُو دِنوں میں بات ختم ہو گئی...... اب کالج کا ماحول پُرسکون ہو چکا تھا ہر طرف صرف اُسی کا نام امن کی پہچان کے طور پر لیا جانے لگا تھا کیونکہ جب امن کے لئے اہم اجلاس منعقد ہوا تو ضلعی انتظامیہ نے اُس سے رابطہ کر

کے کہا کہ آپ امن کے اِس سفر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔
سبھی طالبات، اور قدرے ڈرے طلباء نے سکھ کا سانس لیا...... دن گزرتے گئے......
اِس کام کے بعد اُس کو دی جانے والی رقم بڑھا دی گئی تھی ...... سہولیات اور خواہشات بھی پوری کی گئیں تمام دوستوں نے کئی دن خوب لطف اُٹھایا...... کئی بڑے ہوٹلوں پر راتیں بسر ہوئیں اور اُن راتوں میں کئی گھنی سیاہ زُلفیں ان پر ہر روز نئے انداز سے بکھرتی بھی تو رہی تھیں ...... وہ خیالوں میں آج بھی اُن زلفوں کو اُسی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔
دوسرے روز اس کے خلاف دیئے گئے فیصلے کے خلاف اپیل داخل کروا دی گئی...... اِس دوران اُس کے حق میں اخبارات میں خبریں بھی لگتی رہیں ...... کبھی کبھار کوئی نہ کوئی صحافی خصوصی طور پر اُس پہ کالم بھی لکھ دیتا ...... وہ پُر امید ہو کر زندگی کے بارے میں سوچنے لگا...... اُسے ہوٹل کا قیام...... وہاں کے بہترین کھانے...... مختلف لپکتے جسم...... لمبی کالی بکھرتی زُلفیں...... موٹی خمار سے بھری کھینچتی آنکھیں...... مہنگی گاڑیاں ...... یاد آنے لگیں...... اُسے سہولیات سے مزین گھر نظر آنے لگا جہاں وہ اپنی زندگی بسر کرے گا۔
چند دِن اُس نے خوابوں میں ہی سہی مگر انبساط میں گزارے پھر ایک دِن اُسے یہ سن کر حد درجہ دُکھ ہوا کہ اُس کی اپیل خارج کر دی گئی ہے ...... اِس اطلاع نے اُسے عجیب احساس میں مبتلا کر دیا...... اُسے اپنا وجود شل سا ہوتا محسوس ہونے لگا وہ بار بار اپنے ہاتھوں اپنے جسم کو ٹٹولتا...... اُسے اپنا آپ خالی خولی لگنے لگتا ...... اُس نے محسوس کیا وہ تو دُو حصوں میں بٹ چکا ہے ...... ایک وہ ...... جو کہ وہ ہے...... ایک وہ ...... جو اُس کے ہاتھ محسوس کر رہے ہیں ...... وہ اپنے اندر کے یاسر صدیقی کو ڈھونڈنے لگا ...... وہ بے سدھ ہو چکا تھا ...... کافی تلاش کے بعد خود کو پانے میں ناکام ٹھہرا ۔
دُوسری صبح پہریدار نے اُسے موت کے پروانے کی خبر سُنائی اُس کے تمام کاغذات آ چکے تھے ...... بس عمل ہونا باقی تھا ...... اُس کے کئی دوست، عزیز و اقارب، رشتہ دار اُسے ملنے آ رہے تھے ...... وہ ان کو دیکھ کر اُن پہ رشک کیے جا رہا تھا ...... وہ سب سے یہی کہے جا رہا تھا کہ خدارا اُس کے لئے رحم کی اپیل کی جائے ...... تمام احباب باتوں باتوں اُسے بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اِس وقت حکومت اُس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی ...... جب دُوست ملاقات کر کے گھر

واپس لوٹتے تو اُس کا دِل ڈُوبنے لگتا ۔

پہریدار نے اُسے وہ اخبار لادی تھی ......جس میں اُس کی پھانسی کی خبر لگی تھی ......اخبار کے چوتھے صفحے پر ایک کونے میں لکھا تھا......کل یاسر صدیقی کو پھانسی پر چڑھادیا جائے گا۔

وہ اخبار کے دُوسرے صفحات پر اپنے متعلق خبر ڈھونڈنے لگا ......کئی صفحات پڑھنے کے باوجود اُسے اپنے متعلق کچھ دکھائی نہ دیا۔

اچانک اس کی نظر ایک تصویر پر جا رکی،

پارٹی کے جس اعلیٰ عہدےدار نے اُسے مخالف اُمیدوار کو قتل کرنے پر اُکسایا تھا۔

''وہی'' کانشان بنائے مخالف پارٹی کے عہدیدار کی کمر میں ہاتھ ڈالے مُسکرا رہا تھا۔

اس کے نظریات سمندر سے ساحل کی طرف پلٹتی اُن لہروں کی مانند الٹ پلٹ ہو گئے جو ساحل پر بچوں کے بنائے گھروندے ایسے مسمار کر دیتی ہے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں اور اُس کے جذبات کے اِس انتشار نے یہاں سے دُور ایک گاؤں کے چھوٹے سے کچے مکان میں بھی کسی کو مضطرب کر رکھا تھا۔

دردِ مشترک

ہاں! میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔

شاہد اپنے آپ سے بھی زیادہ......آج دمِ آخر سوچتی ہوں کاش میں کچھ عرصہ آپ کے ساتھ زندہ رہ سکتی۔

سنیئے آپ اکثر کھانا دیر سے کھاتے ہیں بار بار گرم کرنا پڑتا ہے......آپ کھانا وقت پہ کھالیا کریں اور ہاں کپڑے بھی بدلا کریں۔

میں نے آپ کے لیے نئی واسکٹ کا درزی کو کہہ دیا تھا آج صبح وہ دے گیا......پہنیئے گا......بچی آپ پر بہت جچتی ہے۔

ڈاکٹر نے جو دوائی تجویز کی وقت پہ لیجیے گا۔

آپ کو سردی ایک دم پکڑ لیتی ہے ٹھنڈ سے بچیئے گا۔

وہ کسی خیال کے زیر اثر دیر تک پلنگ پہ کروٹیں بدلتا رہا......بظاہر خاموش مگر اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار۔

اُس نے سامنے کی کھڑکی کھولی......گہری سیاہی نے نیلے آسمان کو اپنی اوٹ میں چھپا رکھا تھا......ٹمٹماتے تاروں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا تھا......ٹھنڈی ہواؤں نے اُس کے سینے کو چھوا

بدن میں تھرتھری سی پھیل گئی۔
وہ خود کو ٹٹو لنے لگا گہری خاموشی اور ویرانی اُس کے وجود میں سرایت کر چکی تھی ......اُس کا دل تو اشک بار تھا ہی اب اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنا شروع ہو گئے۔
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے اُس کے چہرے کو سُن کر دیا وہ خود کو نہ صرف اِس گھر بلکہ ساری کائنات میں تنہا محسوس کر رہا تھا۔
وہ ہم کلامی کرتے ہوئے"انسان کا اصل مقام کون سا ہے"
پھر خود ہی جواب دیا"وہ جو اُس کی ملکیت ہوتا ہے"
انسان کی ملکیت کیا ہے؟؟؟
شائد کچھ بھی نہیں۔
اُسے وہ یاد آنے لگی اُس دن اچانک اس کے قدموں کی ہلکی سی آواز نے اُس کے خیالات کا تانابانا بکھیر دیا تھا۔
ٹپ ......ٹپ ......ٹپ ......دھیمے قدم بڑھے جا رہے تھے ......آواز قریب سے قریب تر ہو رہی تھی ......پھر بہت ہی زیادہ قریب درمیانی عمر کی عورت۔
سخت سردی میں ٹھٹھرتی، بوسیدہ چادر اُوڑھے اپنے اکلوتے بیٹے اور خاوند کی قبر پر فاتحہ خوانی اور مٹھی بھر گل پاشی کے لئے آتی تھی۔
کئی کئی گھنٹے کبھی ایک قبر سے تو کبھی دوسری قبر سے باتیں کرتی پھر خود کلامی کرنے لگ جاتی ......نجانے کیوں ......اُس کا یوں قبروں سے باتیں کرنا بے محل سا لگا کرتا تھا۔
انسان کتنا عجلت پسند ہے۔ایک دَم سے ہی رائے قائم کر لیتا ہے۔بغیر سوچے سمجھے۔
اس کا خاوند کسی موذی مرض کا شکار ہو گیا تھا اور بیٹا اچانک کسی حادثے میں اللہ کی رضا۔ وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔
وہ اُس کے قبروں پر ڈالے گئے پھولوں کو دیکھنے لگا ......جو مٹھی بھر سے زیادہ نہ تھے ......
وہ سوچنے لگا ......قبر پر پڑے پھولوں کی مقدار اور معیار کچھ بھی ہو ......پیاروں کی یادوں اور یادوں سے وابستہ باتوں پر بہنے والے آنسوؤں میں چھپا کرب اور جسم میں سرائیت کئے ہوئے بے چینی سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔

قبر پہ حاصل ہونے والا قرب بھلا اور کہاں ملتا ہے۔
قبر بظاہر مٹی کا ایک ڈھیر اپنے اندر کس قدر اپنائیت سمیٹے ہوتی ہے اس مٹی کو چھو کر جو قلبی اطمینان وجود کو میسر آتا ہے وہ اس سے دُور کبھی بھی نہیں مل سکتا۔
قبرستان ایک خاموش بستی جہاں سکوت ہی سکوت ہے ...... یہاں رہنے والے بھی شائد کسی کے آنے کی راہ شدت سے دیکھتے ہوں گے ...... یہ بھی تو اسی خاطر یہاں آتی ہو گی۔
جن کے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کئے جائیں جن کے سوا وقت گزرنا محال سمجھا جاتا ہو ......آج وہ سب دور اپنی الگ تھلگ تنہا دنیا میں آباد کئے ہوئے ہیں۔
وہ چاند کو دیکھنے لگا لیکن اُس کی فکر کہیں اور تھی ......زندگی کتنی جلدی گزر جاتی ہے۔
اُسے اپنا بچپن، بچپن کے دوست اور بچپن کی شرارتیں یاد آنے لگیں ......اُس کی آنکھیں چاند پہ جمی ہوئی تھیں جیسے وہاں کچھ تلاش کر رہا ہو۔
پھر وہ آسمان کی وسعتوں اور وسعتوں میں جگمگ کرتے ستاروں کو دیکھنے لگا "نجانے اِن ستاروں پہ کیا ہو گا۔
کیا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ زمین سے بھی کوئی بڑی دنیا وہاں آباد ہو۔
شاید ہاں ......نہیں ایسا نہیں ہو گا۔
تو پھر وہ سارے اس وقت کہاں ہوں گے ......اُس کے محسوسات کی دنیا جاگ اٹھی اُسے اپنے سارے پیار یلی نظروں کے سامنے گھومتے نظر آنے لگے۔
اُسے اپنے والدین کی یاد ستانے لگی ...... کتنی محبت کرتے تھے ......بابا جان کی پیٹھ پہ سوار ہو کے گلی گلی، بازار بازار کا سفر ...... ماں کی آغوش میں سر نہوڑائے ماتھے پہ ماں کے ہونٹوں کا لمس رہ رہ کر یاد آنے لگا ......یادیں سالوں پہ محیط زندگی کو لمحوں میں گزار دیتی ہیں ......ماں کہاں ہو گی بابا جان کیسے ہوں گے۔
شادی والے دن والدین کی خوشی دیدنی تھی ......بابا جان نے سینے سے لگا کر دعائیں دیں اور ماں نے ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔
سدا پھولو پھلو، خوشیوں بھری زندگی جیو ......بہن، بھائیوں، دوستوں، رشتہ داروں نے خوب جشن منایا تھا۔

ایک فرد کے آنے سے کتنی تبدیلی آجاتی ہے اور صرف ایک فرد کے جانے سے انسان کتنا اکیلا رہ جاتا ہے۔

ایک دن وہ کہنے لگی تھی ...... مجھے بچپن ہی سے کھیت، کھیتوں میں بہتی ندیاں، ندیوں میں نہاتے درخت، درختوں کے گرد ابھرا سبزہ اور اس کی مہک بے حد پسند ہے ......زمین کے درمیان سے گزرتی ندی کی چھنکار کی آواز میں وہ اکثر کھو جایا کرتی تھی ...... کتنی با ہمت اور صابر خاتون تھی کبھی کوئی شکوہ نہ کیا جیسے حالات بھی آتے خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ......اُس دن اُس کا سفید بے داغ لباس اس کے کردار کی غمازی کر رہا تھا...... کتنی صاف، پاکیزہ اور خوبصورت دکھتی تھی اُس کی نظر کھڑکی سے ندی پر جا ٹھہری ......پانی پہ رقصاں چاند کا عکس اور پانی سے منعکس ہوتی چاندنی کی روشنی دل کو سکون دینے لگی تھی۔

وہ اکثر کہا کرتی تھی میں اپنے بچپن میں چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ......چاندنی رات مجھے بہت اچھی لگتی ہے ہر طرف سکون ہی سکون ......اِس روشنی میں کتنا سحر ہوتا ہے۔

مجھے جب والدین، بہن بھائیوں، سہیلیوں کی یاد ستاتی ہے تو میں چاند کو دیکھتی ہوں۔

اور جب مجھے تمھاری یاد ستائے تو میں کیا کروں ......؟؟؟ تم بھی چاند دیکھ لیا کرنا ......اچھا ......تو کیا چاند کو دیکھنے سے تم نظر آجاؤ گی ......ہاں۔

اُس کی بے ساختہ گفتگو اپنے اندر شیریں لئے ہوئے تھی وہ اُس کے چہرے پر نظریں گاڑھے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اب وہ زمینوں میں پہلے سے زیادہ کام کرنے لگا تھا کبھی کبھار بیوی بھی ہاتھ بٹھاتی۔ پیوند کاری کے موسم میں پھلدار درختوں کو قطار در قطار لگایا گیا تھا ......نہر کے پانی کو زمین کے درمیان سے گزار کر دونوں جانب سبزیاں بھی لگائی گئی تھیں۔

اُسے عجیب سی مسحور کن لہر اپنے وجود میں اٹھتی محسوس ہوئی جس نے اُس کے دل و دماغ کو معطر کر دیا۔

اُن درختوں نے خوب پھل دیا جن کے بیج اُس نے اپنے ہاتھوں سے زمین میں بوئے تھے ......وہ سوچنے لگا جن ننھے پودوں کو میں نے اپنے ہاتھ سے پانی دیا وہ آج تناور درخت بن چکے ......کیا کیا خواب بنے تھے ......زمین کے وسیع قطعے پہ مکان تعمیر کیا تھا......آنے والے وقت

کیلئے کتنی منصوبہ بندی کی تھی۔
ہوا میں خنکی بڑھنے لگی ......اُسے اپنا وجود شل ہوتا محسوس ہونے لگا تو وہ کھڑکی بند کر کے پلنگ پہ آن بیٹھا۔
دن کے وقت کہے گئے چھوٹی بھاوج کے الفاظ اُسے بار بار یاد آنے لگے۔
جو سامنے والے درخت کو کاٹنے پہ بضد تھی ...... اُس سے جب اُسے منع کیا گیا......تو طنزاً کہنے لگی......اجی چھوڑیے...... جو درخت پھل نہ دے اس کا کیا فائدہ؟
اُس کی زیرِ لب مسکراہٹ اور چہرے کی کھلکھلاہٹ معنی خیز تھی ......وہ بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی ......میرے بس میں ہو تو ایسے تمام درختوں کو ایک لمحہ نہ رہنے دوں۔
سب کی جڑوں تک کو اُکھیڑ کر جلا دوں۔
بھاوج ...... یہ بہت پرانا درخت ہے اِس کے ساتھ ہماری یادیں وابستہ ہیں ......وہ اُسے درخت سے انسیت بارے کہنے لگا تو اُس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے مالی کو انکھیوں سے اشارہ کیا......اگلے ہی لمحے درخت لاوارث لاش کی طرح زمین پہ پڑا تھا......اُسے لگا جیسے سامنے وہ بے گور و کفن لاوارث پڑا ہے۔
وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے طنطنے کے ساتھ کمرے کی جانب چل دی ......اس لمحے کی یاد اسکی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ کر رہی تھی ......وہ تھر تھرانے لگا۔
پیشانی پہ اُداسی عیاں تھی وہ کسی خیال کے زیرِ اثر سوچنے لگا۔کاش! والدین زندہ ہوتے ......پھر زیرِ لب کہنے لگا اگر زندہ ہوتے تو آج سو سال کے لگ بھگ ہوتے۔
بیوی زیست کے اِس سفر میں میرا ساتھ چھوڑ کے نہ جاتی ......تو ساٹھ کے پیٹے میں ہوتی ......وہ انہی یادوں کو سینے سے لگائے پلنگ پہ لیٹ گیا۔
اُسے نیند نہیں آ رہی تھی ......آج وہ نئے کمرے میں تھا......ہر شے غیر مانوس، پرائی سی دکھ رہی تھی۔
جب سے ہوش سنبھالا ......وہ حویلی میں ہی رہتا رہا وہاں ہی پلا بڑھا...... جوان ہوا......شادی ہوئی ......بیوی کے ساتھ بھی وہیں رہا۔
اُس کے چلے جانے کے بعد بھی وہاں ہی رہا ......اُسے ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا......

اُس یادیں حویلی کی درودیوار کے ساتھ جڑی تھیں ۔

بابا جان ......!......آپ کہاں ہیں......؟؟؟

ماں جی ......!......آپ کدھر ہیں......؟؟؟

ارے چھوٹی مالکن ......!......سنوتو......ارے کس کمرے میں ہو؟؟؟

وہ سب کو پکار رہا تھا مگر وہاں صرف تنہائی تھی ۔

کمرے میں اُسے وحشت محسوس ہونے لگی وہ کمرے سے باہر نکل گیا ہر جانب مکمل خاموشی اور گہرا سکوت تھا......باہر ہنوز اندھیرے نے اپنی حکمرانی قائم کر رکھی تھی ۔

وہ ایک جانب چل دیا...... چیڑھ ،چنار ،شہتوت ،کیکر ،اخروٹ ،سیب ،خوبانی ، ناشپاتی ،آلوچہ ،لوکاٹ کے گھنے درختوں تلے ایک لمبا سانس لیا تو طبعیت میں قدرے ٹھہراؤ محسوس کرنے لگا......ہوا میں بے حد ٹھنڈک تھی ۔

اُسے سرگوشی سنائی دی......ارے آپ......اِس وقت کیوں سردی میں باہر نکل آئے ۔

جائیں جا کر آرام کریں......میں نے کہا جو تھا......سردی میں باہر نہ نکلا کریں ۔

آپ کو ٹھنڈ لگ جاتی ہے......اُس نے سنی ان سنی کر دی ۔

وہ مسلسل چلے جا رہا تھا......قدرے چلنے کے بعد سامنے خوبصورت تراشے گئے پتھروں سے بنی قبر آ گئی......جس کو لوہے کے مضبوط جنگلے نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا ۔

وہ ٹکٹکی باندھے قبر کو دیکھنے لگا......اردگرد کی فضا نے ماحول اداس کر رکھا تھا وہ دل پہ بوجھ سا محسوس کرنے لگا......ایک ہوک سی اٹھی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں ۔

اس نے ایک طرف پڑا دیا جلا دیا......دیا ٹمٹمانے لگا اس نے اپنے ہاتھوں سے دیے کے گرد حصار بنا لیا......ٹمٹماتے دیے کو تا دیر دیکھتا رہا ۔

اُسے وہ دن یاد آیا......جب بجلی سرِشام چلی گئی تھی موسم بھی ابر آلود تھا تو اس نے دیا روشن کیا تھا......جس کی مدہم مدہم روشنی میں اس کا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا اور آنکھوں میں پھیلے سرخ ،گلابی ڈورے نمایاں نظر آ رہے تھے......وہ کہہ رہی تھی کیا آپ میری قبر پہ آیا کریں گے اور پھول ڈالا کریں گے......؟؟؟

ہاہاہا......کیوں نہیں......وہ ازراہِ مزاق ہنسنے لگا تھا......اللہ کرے......ایسا ہی ہو وہ پر

سکون نظر آنے لگی تھی۔

چھوڑو جی ......آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا......کیا یوں کیا کرتے ہیں؟؟

آپ نے تو ساری زندگی ساتھ نبھانے کا ...... وعدہ کیا تھا......پھر کیا ہوا آپ کا وعدہ؟؟؟

آپ کو تو عہد کا پاس رکھنا چاہیے تھا......آپ تو میری ساری زندگی ہی بے کیف کر گئی ہیں ......آپ تو جانتی تھیں کہ آپ کے بعد میرا کوئی نہیں ......آپ نے بھی صرف اپنی تمنا پوری کی ......اتنا تو سوچنا تھا...... کہ پیچھے میرا کیا ہوگا ......بیچ منجدھار مجھے چھوڑ خود چل دیں ......وہ کبھی سرگوشی، کبھی دبے لفظوں تو کبھی قدرے بلند آواز شکوے کرنے لگا۔

اُس کا چہرہ آنسوں سے بھر چکا تھا......درماندگی بھرے الفاظ آنسوں کے ساتھ جاری تھے۔

مجھے بتاؤ میں کیوں جیئوں؟

کس کے لئے جیئوں؟

کون ہے میرا؟

بولو......جواب تو دو......جواب کیوں نہیں دیتی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی خاموشی اختیار کیئے ہوئے ہو ......بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ اپنی دنیا جا بسائی ......نہ دن گزرتا ہے نہ رات کٹتی ہے ......نہ من کو چین نہ تن کو آرام ......ہر سو ویرانی ہی ویرانی ہے ......تم خاموش......جواب تک نہیں دیتی ہو...... اُس کی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں......روتے ہوئے اس کی ہچکی بندھ گئی ......اُسے ماضی کی یادوں نے آن گھیرا ......سنیئے ......آپ اکثر کھانا دیر سے کھاتے ہیں بار بار گرم کرنا پڑتا ہے ......کھانا وقت پہ کھا لیا کریں اور ہاں کپڑے بھی بدل لیا کریں ......میں نے آپ کے لیے نئی واسکٹ کا درزی کو کہہ دیا تھا......آج صبح وہ دے گیا پہنیئے گا......بچی آپ پہ بہت جچتی ہے......تو بہ آپ تو بے حد دیر سے ناشتہ کرتے ہیں اب ناشتہ کر بھی لیں ......کیا دوپہر کیوقت ناشتہ کرنے کا ارادہ ہے۔

کچھ بھی ہو آپ کو ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائی لینا ہوگی جلدی کریں یہ لیں ......اُف آج پھر آپ بھیگ گئے ......اب اندر آ بھی جائیں باہر بہت ٹھنڈ ہے آپ اپنا ذرہ بھی خیال نہیں رکھتے

سردی لگ گئی تو......؟؟؟ ......آپ مجھ سے اپنے بارے پوچھتے ہیں ......اُس دن آپ نے سفید کاٹن کے کپڑے پہن رکھے تھے اور بادامی رنگ کی واسکٹ میں بہت جچ رہے تھے ......آپ کے ساتھ گزرے میری زندگی کے لمحے میرا قیمتی ترین سرمایا ہیں ......جن پہ مجھے فخر ہے مجھے لاکھ بار دنیا میں بھیجا جائے میں ہر بار آپ کے ساتھ زندگی گزارنا چاہوں گی ......آپ کے بغیر زندگی کا تصور نا ممکن ہے ......عورت کی زندگی میں مرد تکمیل یا تخریب کا لازمی حصہ ہے اور سچ پوچھیں تو آپ میرا اٹوٹ انگ ہیں میں ادھوری تھی آپ سے مل کر مکمل ہوئی ......میں جانتی ہوں میں بہت جلد آپ سے جدا ہو جاؤں گی ......میری روح بھی آپ پر نثار رہے گی مجھے بہت تسکین ملے گی جب آپ اپنے ہاتھوں مجھے دفن کریں گے میں نے ساری زندگی عزت سے گزاری والدین کی ناموس کا خیال رکھا آپ سے وفا کی ......ہاں میں بھی انسان ہوں پر میں نے اپنے جسم اور روح کو کبھی پامال نہیں ہونے دیا مجھے صرف ایک بات کا قلق ہے کہ آپ بھی میری طرح مٹی میں مٹی ہو جائیں گے ......شاید ہماری قبروں پہ اُس طرح ......قبروں کا لفظ زبان پہ آتے ہی اُس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

وہ گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا آنکھوں سے آنسو رواں تھے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا ......وہ خود کو بے بس اور لاچار سمجھنے لگا۔

سنو جی ......وہ بھری آواز میں کہنے لگا ......آج میں اُس کمرے میں نہیں سو سکا جس کمرے کی در و دیوار کے ساتھ میری اور آپ کی زندگی کی یادیں منسلک تھیں ......اور ہاں میں نے دوائی لینا چھوڑ دی ......کھانا کھانے کو دل نہیں کرتا ......نیند ......نیند کیسے آئے ......آپ کی یادوں میں رات کٹ جاتی ......بس جی رہا ہوں ......لیکن ایسا جینا بھی کیا جینا میں روز بہ روز ٹوٹتا ہوں ......آپ کے بعد تو میرے ساتھ حد ہو گئی ہے ......آج میں اپنے آپ کو بہت کم تر محسوس کر رہا ہوں۔

مگر کیوں ......؟؟ صرف اِس وجہ سے کہ میں ......اللہ! یہ کیسا انصاف ہے ......کیا آپ کے پاس اِس کا جواب ہے۔

نہیں نا ......ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہم دونوں ایک ساتھ چلے چلتے۔

گلے شکوے رونا دھونا پر وقت بھلا کب ٹھہرتا ہے۔

سورج کی کرنیں پھیل رہی تھیں چڑیوں کی آوازیں اور کوؤں کی آمد و رفت شروع ہو

چکی تھی ......ندی مسلسل شور مچائے جا رہی تھی ......درختوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی ......

وہ قبر پر دعائے مغفرت کر رہا تھا۔

اُسے ......ٹپ ......ٹپ ......ٹپ ......دھیمے قدموں کی آواز سنائی دی جو قریب سے قریب تر ہو رہی تھی ......پھر بہت ہی زیادہ قریب وہی درمیانی عمر کی عورت۔

وہ اُس جانب دیکھنے لگا ایک عرصے سے قبروں پر مسلسل حاضری نے ایک مانوس سا رشتہ بنا رکھا تھا......مٹھی بھر پھول قبروں پر ڈالنے کے بعد وہ دعائے مغفرت کرتے ہوئے روئے جا رہی تھی ......آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے مٹی میں پیوست ہو رہے تھے......نجانے کیوں وہ اُسکے سرتاپا سراپے کا جائزہ لینے لگا تھا۔

کچھ دنوں بعد ایک دلکش چہرے ،موٹی سیاہ آنکھوں والی ،زندہ رہنے کی امنگ سے بھر پور،خوبصورت جسم کی مالکہ اس کے پلنگ پر انتظار کر رہی تھی۔

جنس مخالف سے محبت اور اُس کی غیر مرئی کشش نے دونوں کو ازدواجی بندھن میں جو باندھ دیا تھا۔

خلش

وہ کسی خَلش کا شکار تھا......نجانے کیوں؟؟؟

اندھیرا چھاتے ہی وہ وَحشت زدہ سا ہو جاتا ......جسم میں عجیب سی الجھن محسوس کرنے لگتا......گھر والے اِس دیوانگی کو ختم کرنے کے لئے اُسے کمرے میں قید کر دیتے تھے شائد وہ اِس بات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وَحشت قید کرنے سے کم نہیں ہوتی......اِس کے لئے تو اُس کی سوچوں کو مقید کرنا ہوگا......تا کہ اُس کے خیالات اور محسوسات کو قابو کیا جا سکے......مگر یہ کب ممکن تھا......خیالات اُس پہ اِس طرح وارد ہوتے کہ اِن میں اکثر اوقات تسلسل ہوتا مگر بعض اوقات بے سروپا بھی دَر آتے۔

اِن خیالات میں وہ گُم ہو کر دُنیا سے ہی بے نیاز ہو جاتا......اُسے کسی کی کیا......اپنی بھی کوئی پرواہ نہ رہتی......گھنٹوں وہ ایک ہی حالت میں گزار دیتا......اِس دوران وہ پاگل دِکھتا۔

سب آپس میں کھسر پھسر کرتے ہوئے کہتے اِسے دَورہ پڑ چکا ہے۔

روشنی پھیلنے کو مضطرب تھی......نئی صبح کی صاف ستھری، نہائی دھوئی، پاک کرنیں آہستہ آہستہ ہر جانب خوشی سے گھومنا شروع ہو چکی تھیں......کئی گاؤں کے باسی نماز سے فارغ ہو کر

کھیتوں میں چہل قدمی کر رہے تھے بعض اپنی بھینسوں کو چارہ ڈالنے لگے تو کوئی بکریوں کو کھول کر پہاڑی جانب دھکیلنے میں مصروف تھے ......کئی ڈھور ڈنگر اپنے کھونٹوں سے بندھے اب بھی اپنے مالک کی راہ دیکھ رہے تھے ......پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے باہر آ کر خوب شور مچا رہے تھے ......مرغیاں کوں کوں، کاں کاں، ٹُوٹُو کرتی اپنے پاؤں سے بھوسا، مٹی، سبزی کے پتے، اِدھر اُدھر اُڑا کر اپنے مقصد کی کچھ نہ کچھ شے پانے میں مصروف تھیں ...... جوں ہی وہ کچھ پا لیتیں چوزے چیں چیں کرتے اُن کی چونچ سے آن چونچ ملاتے ......قدرے دُور جوہڑ میں کچھ بھینسیں نہا رہی تھیں اُسی جوہڑ میں مینڈک ٹرا ٹرا کرتے اُچھل کود میں مصروف تھے۔

گھروں میں مدھانیاں، دہی کو لسی اور مکھن میں بدلنے کے لئے چھم چھم چھم کی آواز سے ایک لَے پیدا کر رہی تھیں ...... جوان عورتیں گھروں کے کونوں میں بنے مٹی کے چولہوں میں چھوٹی بڑی، سوکھی گیلی، لکڑیاں ڈالے زُور زُور سے پھونکیں مار کر آگ لگانے میں مصروف تھیں ......بوڑھی عورتیں قدرے بلند آواز میں اللہ اللہ کر رہی تھیں ......درخت سرشاری سے کبھی ایک جانب کو تو کبھی دوسری جانب کو لہک رہے تھے ......وہ اپنی چارپائی پر چت لیٹا کچے مکان کی چھت کے کاٹھ میں نجانے کیا تلاش کر رہا تھا ......اُس کا جسم تو کمرے میں تھا پر اُس کی سوچیں کسی اور جگہ اٹکی ہوئیں تھیں ......

وہ عظمت علی کے بارے سوچنے لگا......جو اِسی گاؤں کا باسی تھا ......عجیب اُلجھن کا شکار تھا ......اُس نے کہا تھا کہ وہ سو نہیں سکتا ...... جب آنکھ لگنے کو آتی تو اُسے کوئی سرگوشیاں کرنے لگتا ......اُسے اندھیرے سے بھی سخت وحشت ہونے لگی تھی وہ اندھیرے میں سہم سا جاتا ...... نہاتے ہوئے بھی خوف ذدہ رہتا کہیں نلکے سے خون نہ اُبل پڑے وہ نہانے سے اجتناب برتنے لگا تھا ......۔

وہ حجام سے صرف اِس خوف سے بال، داڑھی نہ کٹوا تا کہ کہیں وہ اس کی گردن ہی نہ کاٹ دے ......اس کی حالت عجیب سی ہو چکی تھی ......وہ اپنے گھرانے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا ......دو بھائیوں کی ولادت کے بعد والدین نے منتیں مانی تھیں اللہ اس آنگن میں ایک لڑکی دے مگر یہ دعا قبول نہ ہوئی۔

دونوں بھائی جوان ہو گئے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو اللہ نے اُسے دو بیٹے اور ایک

بیٹی عطا فرمائی ......گھر میں رونق اور خوشیاں تھیں والد ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا جبکہ والدہ، پوتی، پوتوں کے ساتھ ہی مگن رہتی۔

پہلے تو وہ ایسا نہ تھا پھر نجانے کیوں ......؟؟؟ وہ چیزیں کم ہو جانے پہ کڑھنے لگا...... چیزیں کم پڑ رہی ہیں اس واہمے نے اُس کی سوچ اور خیالات میں ہلچل سی مچا رکھی تھی۔

ہر وقت کم پڑ جانے کا خوف اُس پر طاری رہتا ...... بھابھی، بھتیجی، بھتیجوں کی وجہ سے مکان کم پڑ جانے کا غم ......والدین سے شاکی کہ وہ میرا خیال نہیں رکھتے ......جبکہ پوتی پوتوں پہ جان چھڑکتے ہیں ......حسد اُس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی ......اُس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

پھر ایک رات نہ جانے کیوں اُس نے ......اپنے والدین، بھائی، بھابھی، بھتیجی اور بھتیجوں کو کھانے میں زہر ملا دیا ......وہ جانتا تھا کہ آج رات اُس کے گھر موت کا رقص ہوگا۔

صبح سویرے اُس کی آہ و بکا سے اہلیانِ محلّہ جمع ہو گئے تھے......سات افراد کی موت نے پورے علاقے کو افسردہ کر دیا تھا...... پولیس آ چکی تھی......صحافیوں نے تصاویر بنائیں...... اخبارات میں شہ سرخیاں لگائیں ......تفتیش اور تحقیقات کا کام جاری رہا......بالآخر فائل داخل دفتر ہو گئی......وہ صاف بچ نکلا تھا ......وہ قدرے مطمئن ہوا کہ اب ہر شے صرف اُس کی ہے......وہ شادی کرے گا اور ساری جائیداد کا اکلوتا وارث کہلائے گا مگر کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ وہ رات میں ڈرنے لگا۔

اُس کی ذہن کے نہاں خانے میں کوئی خلش اُسے ٹھونگیں مار رہی تھی۔

ڈاکٹروں سے کافی علاج کروایا کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اِسی دوران اُسے انجانے سے خوف نے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہتا۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔

کس سے بچایا جائے؟؟؟۔ کسی کو کچھ سمجھ نہ آتی۔

اُسے دروازے چلتے نظر آتے تو کبھی اُسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی جانب کوئی جاتا دکھائی دیتا......کبھی پانی کی جگہ خون نظر آنے لگتا۔

باتھ روم کا استعمال اِس ڈر سے نہ کرتا کہ کہیں کموڈ سے سانپ نہ نکل آئیں۔ اُس کی ذہنی اور جسمانی حالت تباہ ہو رہی تھی۔ روحانی علاج کے لئے دُور دُور تک چکر لگائے۔

جہاں کسی نے بتایا وہ جٹ سے وہاں پہنچا۔تعویز، دام ورود، سب کروائے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ایلوپیتھی کی ادویات استعمال کیں کچھ فرق نہ پڑا۔ہومیوپیتھی کا علاج کروایا حالت جوں کی توں ہی رہی۔اُس کے اندر کا خوف کسی طورختم ہونے کو ہی نہ آتا۔ہر وقت گہری سوچوں میں گم، معاشرے سے بے نیاز، خود سے لاتعلق، جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں اُس کے اندر خوف، ڈر، پریشانی اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔اِسی کشمکش میں وہ شہر شہر گھوما۔مضبوط معاش کی وجہ سے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

سنیاسیوں سے بھی رجوع کیا مگر دوائی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ہر طرح کی ادویات کے استعمال کے باوجود حالت دن بدن بگڑتی ہی گئی۔وہ اپنے بارے سوچنے لگا۔وہ کس قدر تنہا اور لاچار ہے سکون جیسے اُس کی زندگی سے نکل چکا۔بے سکونی اُس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔اس کا دِل ڈوبنے لگتا نہ گھر میں جی لگتا اور نہ ہی دوستوں کے ساتھ دو گھڑی بیٹھنے کی تمنا ہوتی۔

اُسے وہ وقت یاد آنے لگا جب دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں طویل وقت گزر جایا کرتا تھا۔سینما میں فلم بینی کے ساتھ ساتھ رات گئے تک محفلوں میں گپ شپ ہوتی۔اب وہ خود کئی مسائل سے دوچار تھا سب سے بڑا مسئلہ خوف تھا۔انجانا خوف، جس نے اُس کا سکون غارت کر رکھا تھا۔وہ خود کو اپنے تئیں ڈھارس دینے کی ناکام سی کوشش کرتا۔پھر اُس کا اپنا آپ ہی اُس کا ساتھ دینے سے اجتناب برتا۔ایک دن اُس نے اِن تمام غموں سے چھٹکارا پا لیا۔چھٹکارا پانے کے لئے اسے اپنی گردن خود ہی کاٹی پڑی تھی۔

پھر اُسے اپنے پڑوسی عباس کا خیال آ گیا بچپن میں ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے۔سکول بھی ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔اُس دن وہ ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھا بازار کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔بالکونی کے سامنے کی سڑک، دائیں بائیں کا پورا بازار، بازار میں چلتی گاڑیاں، آتے جاتے مردوزن، بچے بچیاں سب نظروں کے سامنے تھے۔

عباس کو یہ جگہ شروع ہی سے بہت پسند تھی سامنے کا سارا منظر، آتے جاتے لوگوں کا جمِ غفیر، سب اپنے اپنے کاموں میں مگن، فٹ پاتھ پہ بیٹھے بھیک منگے، ایک جانب ریڑھی پر سامان لادے صدائیں دیتے ریڑھی بان، سامان یہاں سے وہاں لے جاتے مزدور، ایک کونے میں اونچی آواز سے پلاسٹک کے تھیلے فروخت کرتے بچے، سامنے پلازے کے زیریں اور بالائی

دکانوں سے سامان خریدنے والے گاہگ سب کے سب اپنی دنیا میں مگن۔
اُسے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی.....تو بیرے کو چائے لانے کا کہا اور سگریٹ سلگا کر بیرے کا انتظار کرنے لگا.....تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سامنی کرسی پر اس کا دوست صدیقی بھی آ بیٹھا.....سفید کپڑے اُس پر بہت جچ رہے تھے۔
عباس کی اُس دن پیسوں پر بڑے بھائی سے لے دے ہوئی تھی .....صدیقی اُسے سمجھانے اور منانے وہاں آیا تھا۔
"دیکھو عباس.....! یہ دنیا ہے..... یہاں خوشیوں، مسکراہٹوں، شادمانیوں، مسرتوں کے ساتھ ساتھ غم، دکھ، درد اور کرب بھی موجود ہیں.....تم اِس وقت اپنے مسئلے کو بہت بڑا مسئلہ سمجھ رہے ہو جب کہ حقیقت میں یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔
یہ معاملات مل بیٹھ کر حل کیے جا سکتے ہیں.....لوگوں کو ٹٹولو گے تو مسائل کے انبار نظر آئیں گے" عباس رنجیدہ اور قدرے غصے میں تھا اُس کے چہرے پہ افسردگی پھیلی تھی..... چہرے کا رنگ فق، کپکپاتے ہونٹ اُس کے اندر کی ہلچل کی غمازی کر رہے تھے.....وہ سامنی دکان پر نظریں جمائے خاموشی کی تصویر بنے بیٹھا رہا۔
دوست کی جانب سے بار بار اُٹھتے سوالات.....آخر عباس پھٹ پڑا۔
صدیقی.....! .....بات یہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو.....میں نے بہت محنت کی تم نے دیکھا اُس نے کتنے غلط طریقے سے۔
"ہاں ہاں تم ٹھیک کہتے ہو.....صدیقی نے بات کاٹتے ہوئے لمبی سانس لی۔
عباس نے بازار سے نظریں ہٹا کر صدیقی کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔
صدیقی نے کرسی سرکائی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا.....صدیقی کچھ لمحے سوچنے کے بعد کہنے لگا۔
ہر ایک کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہے.....بس مسئلے کی نوعیت الگ الگ ہے۔جس کے پاس جائیداد ہے.....بڑا گھر ہے.....اُس کی اولاد نہیں۔جن کی اولاد ہے.....اُن کے پاس اُنھیں رکھنے کے لیے جگہ نہیں۔جہاں پیسے کی ریل پیل ہے.....وہاں اتفاق کا فقدان ہے۔جہاں اتفاق ہے..... وہاں بھوک اور ننگ نے منہ کھول رکھا ہے۔جہاں بھوک ننگ نہیں .....وہاں

بیماریوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔جن کے پاس ہم سب کچھ سمجھ رہے ہیں ......وہ بھی کسی نہ کسی روحانی، جسمانی، ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں۔جہاں بیماریاں نہیں ...... وہاں خاندانی جھگڑے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔جہاں جھگڑے نہیں ...... وہاں کوئی نہ کوئی اور مسئلہ ہوگا۔میرے دوست! ......جس کو بھی کریدو گے تمھیں کوئی نہ کوئی کمی ......کوئی نہ کوئی غم ......کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ملے گا۔

عباس روہانسا ہو کر کہنے لگا ......صدیقی یار ...... میں تباہ ہو جاؤں گا میں کس طرح سنبھل پاؤں گا ......سوچو تو ......؟؟؟ صدیقی اُسے چائے کی پیالی تھماتے ہوئے دلاسا دینے لگا۔

عباس میرے بھائی میرے دوست! ......ہم بے سمت، بے مقصد اور بے ہنگم دوڑ لگائے ہوئے ہیں۔

دوسروں کا حق مارنے میں مگن ہیں ......مگر وہ ذات جس کو رب کریم کہتے ہیں ......وہ سب دیکھ رہا ہے اُس کے فیصلے اعلیٰ ہوتے ہیں ہمیں اُس کے فیصلوں پہ صابر رہنا چاہیے۔وہ جو کرتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔

عباس کو بھائی نے کاروباری شراکت سے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی ......عباس جس نے دن رات کی محنت سے کاروبار کو عروج دیا ......اُسے بے دخل کر دیا گیا تھا۔اس نے چارپائی پہ کروٹ بدلی اور آنکھوں کو بھینچنے لگا ......اس کی نظروں کے سامنے سدرہ آن کھڑی ہوئی ......وہ سدرہ بارے سوچتے ہوئے خود کلامی کرنے لگا تھا۔

سدرہ! ......آہ ......سدرہ۔وہ زیر لب بڑبڑایا۔

تم بھی اِس بے رحم اور ظالم زمانے کے ہاتھوں آخر شکست کھا ہی گئی ہو۔

سدرہ ......کیا تم مر چکی ہو......؟؟؟ ......اُس نے خود سے سوال کیا۔

ہاں ......مگر......کب ...... ؟؟؟......کل۔

کل ......کل تو صرف تمھارے جسم کو زمین کے حوالے کیا گیا ورنہ مر تو تم اُسی دن گئی تھی ...... جس دن والدین شہر میں بم بلاسٹ کا شکار ہو کر تمھیں سنگ دل زمانے کے حوالے کر گئے تھے ......بم بلاسٹ کرنے والے سے سدرہ یا اُس کے والدین کی کیا دشمنی تھی؟؟؟ وہ قدرے غصے میں خود سے پوچھنے لگا۔

شائد اِس ملک میں پیدا ہونا ہی دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تھی ......ہاں ......یہی وجہ ہو

سکتی ہے۔

اُس وقت سدرہ کی عمر کتنی تھی ......اُس نے خود سے سوال کیا۔

شاید دس بارہ سال کے لگ بھگ ہوگی ......وہ کسی خیال کے زیرِ اثر سوچنے لگا۔

وہ دس بارہ سال کی تھی، جب یہ پہاڑ جیسا غم اُس پہ آن گرا تھا۔

پھر......؟؟؟ ......پھر کیا......؟؟؟ وہی جو یہاں اِس معاشرے میں ہوتا ہے۔والدین کا سایہ اُٹھ چکا تھا......کم سنی میں ہی اُسے دولہن بنا کر آنکھوں سے اُوجھل کر دیا گیا۔ حالانکہ اُس کی عمر شادی کی تو نہ تھی۔

اُسے والدین کے ترکے میں سے صرف ایک اُدھیڑ عمر خاوند ملا تھا جو کسی بھی طور اُس کے قابل نہ تھا......کہاں سدرہ کہاں وہ۔پھر جلد ہی وہ بھی سدرہ سے دُور رہنے لگا۔سدرہ جاتی بھی تو کہاں ......کہتی تو کس سے؟؟؟

میکہ...... میکے والوں کو بھلا اُس کی کیا پرواہ تھی۔اور میکے میں تھا بھی کون......؟؟؟ ایک نک چڑھی چچی ......ایک جورو کا غلام چچا......اُنکی منہ پھٹ بیٹی اور دنیا کے رکھ رکھاؤ سے آزاد دو بیٹے۔اِن میں سے کسی کے ساتھ بھی سدرہ کی کبھی نہ بنی تھی...... پہلے اُس سے تعلیم چھڑوائی گئی...... پھر گھر سے ملازمہ کو چھٹی دے کر گھر سدرہ کے حوالے کر دیا گیا۔ والدین کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اُس کی شادی کروادی گئی......اُس کی شادی کے دِن اُس کی کسی سہیلی نے بھی نہ کھانا کھایا اور نہ ہی گانا گایا تھا۔پھر یہ چہ میگوئیاں بھی بازگشت کرنے لگیں کہ سدرہ کا خاوند اُسے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے......سدرہ کے متعلق جو کچھ بھی کہا جا رہا تھا......کیا وہ سچ تھا؟؟؟ زندگی اتنے موڑ بھی مڑ سکتی ہے شاید اُس کمسن نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔چچا نے اُس کا ہاتھ جس ہاتھ میں تھمایا وہ اُس ہاتھ سے نبھا کیے جا رہی تھی۔وہ جلد ہی جسمانی نقاہت محسوس کرنے لگی تھی......قسمت کی ستم ظریفی کہ وہ اپنا دکھڑا کسی کو سنا بھی نہیں سکتی تھی...... وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے والی لڑکی نہ تھی۔اُنہی دیواروں کی ہو کر رہ گئی...... اُس کی بچپن کی سہیلی شبنم ......ہاں وہ اُسے کبھی کبھار ملنے جایا کرتی تھی۔اُس دِن کے چند لمحے سدرہ کی زندگی کی خوشگوار ساعتیں ہوتیں۔

شبنم سدرہ سے بہت محبت کرتی تھی وہ اُس کی ہمت بندھاتی ......اس کے زخموں پہ

پھاہا رکھتی ......سدرہ کا شکی قلب خاوند جو عمر میں اُس سے پینتیس سال بڑا تھا اور سدرہ سے قبل دو بیویوں کو طلاق دے چکا تھا ......دولت کی ریل پیل اور بڑی حویلی کا مالک۔

کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ سدرہ کے چچا نے سدرہ کی قیمت وصول کی تھی اسی قیمت پر اس نے ترقی کی منازل طے کیں ...... جب سدرہ کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو اُس کی شادی کو پورے پانچ سال گزر چکے تھے وہ اِس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ تھوڑا سا چلنے سے چکر محسوس کرنے لگتی......شادی کے بعد بچوں کی پے در پے اموات لیڈی ڈاکٹر نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی ماں نہیں بن پائے گی......شادی کے شروع میں ہی اُسے کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑا...... پھر ادویات کے استعمال نے رہی سہی کسر بھی نکال دی، نیلی چمکتی آنکھوں، بھورے لمبے بالوں، خوب صورت ناک نقشے والی والدین کی لاڈلی سدرہ۔ سدرہ......ایک زندہ لاش......نیند کی کمی، بھوک نہ لگنا، سینے میں درد، چکر آنا اور چل نہ سکنے کی وجہ سے اُس کا ناک نقشہ ہی بدل چکا تھا......گردوں میں درد نے اُسے نچوڑ کے رکھ دیا تھا...... اُس درد سے وہ چیخ اٹھتی پھر وہ زمین پہ مچھلی کی طرح پھڑکتی رہتی ......نیلی چمکتی آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہو گئے تھے۔

چہرہ پژمردہ ہر قسم کے جذبات سے عاری...... بیماری کی وجہ سے چڑچڑا پن اور کمزوری کی وجہ سے غصہ اُس کی عادت بن چکا تھا...... درد ہی اُس کا اوڑھنا بچھونا تھے...... خاوند ملک علی نواز خان بھی اس کی طرف اب کم توجہ ہی دیتا...... سننے میں آیا کہ اُس نے شہر میں اور شادیاں بھی کر رکھی تھیں۔

بھولے سے کبھی گاؤں آ جاتا تو کئی الزامات اور طعنے دے کر واپسی کی راہ لیتا پھر ان الزامات اور طعنوں پر سدرہ کڑھتی رہتی۔

اس دن سدرہ نے غسل کیا تھا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنی ہی دیر وہ اپنے آپ کو دیکھتی رہی شائد وہ آئینے میں اپنا آپ تلاش کر رہی تھی۔

وہ اپنے وجود میں اپنا سراپا ڈھونڈنے میں مگن تھی ......نیند تو اُس کو آئی نہیں تھی مگر غسل کی وجہ سے کھانسی میں کافی دیر افاقہ رہا...... وہ لمبی لمبی سانسیں لینا چاہتی تھی مگر اُس کا سینہ اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا......سانس حلق میں ہی کہیں اٹک کر رہ جاتی ...... رات بستر

پہ لیٹے وہ اپنے ماضی کی یادوں میں کھوگئی جب اُس کی والدہ اُس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے مساج کیا کرتی تھی اور وہ کروٹ پہ کروٹ بدلتی گہری سانسیں لیا کرتی ...... پھر اُسی آغوش میں گہری نیند سوجایا کرتی ۔

ماضی کی سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے اُس کے افسردہ چہرے پہ ہلکی سے مسکراہٹ پھیل چکی تھی ...... کھلی آنکھوں اُس نے اپنی والدہ کا لمس اور والد کا پیار محسوس کیا...... ایک سرشاری اس کے جسم میں کوندگئی تھی ...... اُسے اپنے جسم میں آرام اور سکون محسوس ہونے لگا تھا......نجانے کب اور کس لمحے اُس کی آنکھیں بند ہوئیں مگر یہ آنکھیں پھر کھل نہ سکیں ......صبح بستر پہ سدرہ سانس اور بدن کے باہمی رشتے سے آزاد تھی ۔مگر یہ تو ساری سنی سنائی باتیں ہیں کچھ سرگوشیاں بھی تو گردش کرنے لگیں تھیں ۔

سننے میں یہ بھی تو آیا کہ ملک علی نواز خان نے خود اُس سے جان چھڑائی ورنہ وہ اتنی بھی تو بیار نہ تھی کہ اچانک اس طرح وہ موت کی آغوش میں چلی جاتی ......بات کچھ بھی ہو اس نے اب واپس تھوڑا ہی آنا تھا...... وہ تو زندگی کی مصیبتوں سے رہائی پا چکی تھی ۔

اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کروٹ بدلی ......سدرہ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا......پھر نجانے کن سوچوں نے اُسے اپنے دامن میں بھرلیا...... وہ کسی سوچ کے زیرِسایہ ہچکولے کھاتے ہوئے کہیں دُور نکل گیا ......مسائل کا سب کو پتہ ہے مسائل کی نشاندئی بھی سب کرتے ہیں مگر اِن کا حل کوئی بھی تو نہیں بتاتا ......کیا مسائل کے حل کے لئے اُن کا بتا دینا کافی ہوتا ہے؟؟؟

نہیں ہرگز نہیں ...... وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو مسائل کے حل کی خاطر سنجیدگی سے عمل پیہم کرتی ہیں ورنہ ان کواجاگر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ۔

مسائل کا حل کیسے ہو......؟؟؟ شائد طاقت سے ۔

نہیں اس طرح تو اور مسائل پیدا ہوں گے ۔

ہمیں سوچوں کو بدلنا ہوگا لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا......انھیں بتانا ہوگا کہ اُن کا فائدہ اور آنے والی نسل کا مستقبل کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے......مگر لوگ کب سنیں گے......اُن کے اپنے بہت سے بکھیڑے ہیں ...... وہ بھی کہاں کہاں قربانی دیں ......اُن سے

جب بھی قربانی مانگی گئی انھوں نے کبھی بھی پیٹھ نہیں دکھائی ۔

پھر؟ ......وہ جواب ڈھونڈ ھنے لگا ۔

ہمیں معاشیات ٹھیک کرنی ہو گی ......غربت زدہ معاشرہ اور بھوک سے سسکتے مرتے لوگ کوئی بھی تبدیلی نہیں لا سکتے ......تبدیلی کا وہی سوچیں گے جن کے پیٹ بھرے ہوں گے ۔

جن کے گھر کے اخراجات اُنھیں باؤلا نہیں کریں گے ۔غریب کو تو کوئی قرض بھی نہیں دیتا ......اچانک اس کے ذہن کے نہاں خانے میں چھپا عمر گل سامنے آن ٹپکا ۔

ہاں ......ایسا ہی عمر گل کے ساتھ بھی ہوا وگرنہ ایک وقت تھا ......جب اُس کے کام میں چل چلاؤ تھا تو وہ جس سے بھی دس پندرہ ہزار مانگتا اُسے مل جاتا ......مگر جب سے مالک نے دکان خالی کروائی اور جمع پونجی نئی دکان دیکھنے میں صرف ہو گئی تو عمر گل دکان سے ریڑھی پہ جا پہنچا اخراجات پورے کرنے اُس کے بس میں نہ رہے پھر مہنگائی نے رہی سہی کسر بھی نکال دی ۔

اب وہ کرے تو کیا کرے قسمت کی ستم ظریفی دو بچیاں اللہ نے دیں تو اُن کی والدہ زندگی کے سفر میں دار مفارقت دے گئی ......دکان مالک نے واپس لے لی نئی دکان کا ایڈوانس اور کرایہ اُس کی دسترس سے باہر تھا ......گلی گلی ریڑھی پر صدائیں دینے کے بعد واپسی ہوئی تو مالک مکان سر پہ آن پہنچا ......عمر گل اُسے دیکھتے ہی گہری سوچوں میں ڈوب گیا ۔

شائستہ ......عمر گل کی بڑی بیٹی جو جماعت چہارم کی طالبہ تھی دوڑی دوڑی آئی اور ایک ہی سانس میں کہنے لگی ......ابو جی ......ابو جی! ......کیا میری کا پیاں لائیں؟

عمر گل بیٹی کے چہرے پہ نظریں گاڑھے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ چھوٹی عائشہ پیار بھرے لہجے میں پوچھنے لگی ......ابو جی ......میری پنسل اور ربڑ ......

مالک مکان ثاقب اپنی سناتے ہوئے ......عمر بھائی آپ کا چار ماہ سے مکان کا کرایہ نہیں ملا آخر کب دیں گے؟

عمر گل نے لجاجت بھرے لہجے میں کچھ مہلت مانگی ۔

مہلت مہلت ---یہ لفظ سن سن کر کان پک چکے ۔آپ چار پانچ روز میں مکان خالی کر دیں ۔ثاقب نے قدرے کرخت لہجے میں کہا اور چل دیا ۔

عمر گل صبح ہوتے ہی اپنے دوستوں کے پاس قرض لینے پہنچ گیا ......کون سی جگہ تھی جہاں

وہ نہ گیا تھا۔سب نے چائے کا پوچھا ایک دو نے تو چائے پلا بھی دی۔

مگر پیسے؟ اُدھار کا تقاضہ کرتے ہی سب نے اپنے اپنے مسائل کا پنڈورا بکس کھول سامنے رکھ دیا۔

عمر گل سارا دن کبھی ایک تو کبھی دوسرے پاس خاک چھانتا خالی ہاتھ واپس لوٹا...... بچیاں والد کی راہ دیکھ رہی تھیں ......اُن کے چہروں کا پھیکا پن بتا رہا تھا کہ اُن کے پیٹ خالی ہیں ...... گھر کے ایک کونے میں پڑے گھڑے سے پانی پہ ہی گزارہ کرتی رہیں ......عمر گل نے بچیوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر ان سے نظریں ملانے کی بجائے آسمان کی جانب دیکھنے لگا ...... نجانے وہ فضا میں کیا تلاش کر رہا تھا ......شائد پرندوں کی اُڑان یا پھر نیلے آسمان کی وسعت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

مکان خالی کرنے کا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا...... جیب میں ہاتھ ڈالا تو چند سکے ہاتھ آئے ......گھر میں نظر دوڑائی کونے میں کھڑی ریڑھی کے سوا کچھ نہ تھا ......اُسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا......وہ ریڑھی جو چند ماہ قبل اُس نے پانچ ہزار روپے میں مشکل سے خریدی تھی ...... جب فروخت کرنے گیا تو اُس کی قیمت چھ سو روپے ہی وصول ہوئی اُس نے کھانے پینے کا سامان لیا اور گھر کی راہ لی ......اُس کا جسم پسینے سے شرابور تھا......ہاتھوں میں پکڑی کھدال زمین کا سینہ چیرتی جا رہی تھی ......صبح تو کام مل جانے پہ خوشی کی کوئی حد نہیں تھی مگر اِس وقت اُس کا جسم تھکاوٹ سے چور چور تھا ......کام آدھے کے لگ بھگ ابھی باقی تھا ......وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پاس رکھے گھڑے سے پانی بھی پیتا اور چہرے پر بھی چھینٹے ڈالتا ......گرمی سخت، کام زیادہ تھا مگر دام بھی تو مناسب تھے ......مغرب کی اذان ہو رہی تھی جب کام سے فراغت ہوئی ......سات سو روپے اُس نے دُوبارہ گننے کے بعد جیب میں ڈالے پھر کھدائی کروانے والے کو سلام کیا اور گھر واپسی کا قصد کیا۔

اُس کی خواہش تھی کہ اُس کی بیٹیاں کسی طور پڑھ لکھ جائیں۔ وقت انسان کو کتنا بدل دیتا ہے......پندرہ سال دن رات محنت کرنے والے عمر گل نے اپنے حصے کا کام بخوبی سرانجام دیا۔

شائستہ نے اپنی تعلیم مکمل کی اور ہسپتال میں ہیڈ نرس کے عہدے پر تعینات ہوئی۔ عائشہ ایک مقامی اسکول میں معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہے۔

عمر گل جیسے حالات سے چند گلیاں چھوڑ ایک اور خاندان بھی نبرد آزما تھا ......فرق یہ تھا

کہ وہاں دو بچے عرصے سے بیماری میں بھی مبتلا تھے ......والد بے روزگاری کا شکار تھا گھر کے مکین کئی دنوں سے بھوکے تھے ......گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی ......سفید پوشی کا بھرم ہاتھ پھیلانے سے قاصر تھا......والد جب بیمار بچوں کو دیکھتا ......اُن کی بھوک بارے سوچتا تو اُسے کچھ سجھائی نہ دیتا......پھر ایک دن اُس نے تمام امتحانوں سے نجات پالی۔

اپنے ہاتھوں اپنے ننھے منھے بچوں کو ذبح کیا بیوی کی گردن کاٹی اور خود کو اِس جرم کا کفارہ ادا کرتے ہوئے پھانسی لگا دی......پھر نجانے کیا ہوا۔

وہ اُونچی آواز میں ملغظات بکنے لگا......اُس آواز میں گرج اور وحشت تھی......دُشنام طرازی کا محور پورا نظام تھا۔

وہ کہہ رہا تھا......کہاں ہیں......باہر نکالو۔

اُن جھوٹے مکاروں، دھوکے بازوں، غاصبوں کو جنھوں نے ہمیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ جو ہمارے بچوں کے منہ سے روٹی تک چھین لینا چاہتے ہیں۔ کدھر ہیں......جلدی کرو......مجھے بتاؤ......سامنے لاؤ۔ وہ سیاسی پنڈت جو عوام کی خدمت کی خاطر میدانِ سیاست میں آنے کے حلف دیتے رہے۔ وہ فلاحی تنظیمیں جو انسانیت کے نام پر چندے جمع کرتی رہیں۔ وہ لوگ جو مسجدوں اور امام بارگاہوں کی تعمیر پر کروڑوں خرچ کر کے خود کو جنت کا حصے دار قرار دیتے ہیں۔ وہ کمیٹیاں جن کے ممبران خود کو سماجی کارکن قرار دے کر تصویریں بنواتے ہیں۔ وہ میڈیا جو غریبوں کی آہیں، آنسو اور سسکیاں بیچ بیچ کر اپنی تجوریاں بھرتا جا رہا ہے۔ وہ مذہبی ٹھیکیدار جو اکرام مسلم اور احترام انسانیت پر گھنٹوں گلے پھاڑ پھاڑ کر تقریریں کرتے نہیں تھکتے۔ وہ سب کو بے لاگ کوس رہا تھا......اس کے منہ سے تھوک جھاگ کی صورت اِدھر اُدھر اُڑ رہا تھا۔

اُس کی غلیظ گالیاں سن کر گھر اور اڑوس پڑوس والے کہنے لگے شاید اُسے پھر سے دورہ پڑ گیا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا......لگتا ہے بے چارہ کسی خَلِش کا شکار ہے۔

غلاظت

ایک ضرورت جو تسکین کا باعث ہے ۔بے چینی اور اضطراب کا موجب بن رہی تھی ۔وہ کیا کرتا؟؟

سماج اور معاشرے کی پابندیاں اِس جذبے کی تسکین میں حائل جو تھیں ......طوفان اندر ہی اندر سب کچھ ملیا میٹ کر رہا تھا۔خواہش کی لہر اُس کے اندر ہی اندر اٹھتی اور نا آسودگی کا باعث بن کر بے چینی میں مزید اضافہ کر دیتی ......کسی بھی شہ کی محرومی انسان کو کمتر سا کیوں بنا دیتی ہے؟؟ وہ خود سے مخاطب ہوا۔

ہاں ......مگر......کیا کیا جائے؟

اُسے کچھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے کس سے ڈر ہے؟ وہ ہم کلامی کر رہا تھا۔مجھے لبادہ اوڑھ لینا چاہیے۔نیا لباس پہن لینا کونسا جرم ہے۔اِس حجاب نے مجھے کیا دیا؟ سب آسانی سے میری گرفت میں آ سکتا ہے۔سب کچھ ممکن ہے......پر......؟

پر کیا......؟

یہاں کون ہے جس نے چہرے پہ چہرہ نہیں سجا رکھا۔کئی تو تین تین، چار چار چہروں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور معاشرے میں ان کا ایک مقام بھی ہے۔

آخر کب تک اَن دیکھے خوف سے میں خود کو اِس طرح پامال کرتا رہوں گا......مجھے کوئی سبیل نکالنی چاہیئے۔جو مجھے چند لمحوں کا ہی سہی پرسکون تو دے۔میری یہ خواہش جو میرے اصل

سے ہے معاشرے کی فرسودہ، گھسی پٹی روایات نے نقل بنا کر تلچھٹ میں بدل دی ہے۔
کیا اپنی روح کو میں خود داغ دار کر رہا ہوں یا معاشرے کی وہ تقسیم اِسے ذبح پہنچا رہی ہے جو انھوں نے لبادے کے طور پر اوڑھ رکھی ہے۔
کب تک معاشرے کے رحم و کرم پر سسک سسک کر زندگی گزارتا رہونگا...... کب تک دُھند میں سفر کیا جا سکتا ہے جب کہ منزل کا کچھ پتہ ہی نہ ہو اور اگلے دو قدموں پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا ہو...... پہلے ایک دُھند میں تھا پھر دوسری میں اب تیسری میں آ پہنچا پھر اس کی پاداش میں چوتھی میں دھکیل دیا جاؤں گا۔
کیا انسان کی یہ محرومیاں ہی اُس کا امتحان ہیں ......شاید ہاں ......شاید نہیں۔
جس طرح کی آسودگی میں چاہتا ہوں وہ مجھے میسر نہیں اور جو مجھے میسر ہے اُس میں آسودگی نہیں۔آسودگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک دن میں بھی آسودگانِ خاک میں شامل ہو جاؤں گا۔
یہ اُلجھن جو مجھے بے چین کیئے ہوئے ہے اور میری دسترس میں بھی نہیں۔نجانے کب تک میرے اعصاب پر سائے کی مانند سوار رہے گی۔ہمیں انسانی تقاضوں کو کھلے دِل سے تسلیم کر لینا چاہیئے ......تنہائی اور افسردگی کو نشاط بھری زندگی میں بدل دینے میں کیا مضائقہ ہے ......وہ جھلاہٹ میں زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔
کھانے سے فراغت کے بعد کافی دیر تک وہ ایک کمرے میں رہے ......اِس دوران جسم جسم کا ہم راز بنا رہا......اس کی گردن کی نسیں قدرے اُبھر گئی تھیں ...... ہاتھ اُچھر چکے تھے ......آنکھوں کے سامنے چھریرا بدن اپنی رعنائیوں کے ساتھ بازوں کے حلقے میں سمٹ کر سینے میں ٹھنڈک کا سماں پیدا کرتا رہا ....تھرکتا، چھلکتا، سفید بدن آتش فشاں کی طرح اُمل رہا تھا ......رَس بھرے ہونٹ نم سے ہو چکے تھے ......جسم کی تپش ماتھے سے پسینے کی صورت نمودار ہوئی ہونٹوں میں سرخی اور وجود میں حدت محسوس ہونے لگی ......رخساروں، ہونٹوں، اور پھر گردن پر کئی نشانات ثبت ہو چکے تھے ......وہ مستی کے عالم میں پوری طرح محو رہے تھے اِس قدر مخمور کے دنیا سے بے نیاز باہم ایک جان دو بدن ......کئی بار اُسے محسوس ہوا کوئی انھیں چھپ کہ دیکھ رہا ہے ......وہ جب بھی اس بابت بات کرتا تو وہ سنی اَن سنی کر دیتی ......کئی بار تو ایسا ہوا کہ سوال کے ساتھ ہی وہ اُسے اپنے حصار میں لے لیتی اور بات بات میں ہی کہیں رہ جاتی۔
رات ایک بجے کے قریب وہ سو گیا ......صبح سامنے والی منزل پر نظریں جمائے بڑے

انہماک سے کچھ دیکھنے کی سعی کرتا رہا تھا......مگر وہاں کوئی نہ تھا......آنکھوں میں نیند کا خمار باقی تھا......واپس پلٹا اور لیٹ گیا نجانے کس سمے اُس کی آنکھ پھر سے لگ گئی آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی...... منہ دھونے کمرے سے باہر آیا تو اچانک نظر سامنے جا ٹکی......سفید رنگت، سیاہ آنکھیں، گھنی زلفیں، چمکتے دانت، چھریرا بدن ایک خوبصورت سی لڑکی اُسے کچھ کہنا چاہتی تھی......وہ کافی اُلجھی ہوئی دکھ رہی تھی۔

اس کی اُلجھن دیکھ کر جونہی وہ اُس کی جانب متوجہ ہوا......اچانک اُس کا پڑوسی بھی سامنی چھت پر آن ٹپکا......اس نے دانستہ وہاں سے نظر ہٹائی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا قدرے توقف کے بعد جب دوبارہ دیکھا تو وہ جا چکی تھی......وہ کیا کہنا چاہتی ہوگی وہ تذبذب میں مبتلا تھا......اسی دوران اس کے فون سیل پر میسج کی گھنٹی بجنے لگی......جلدی سے منہ دھو کر کمرے میں گیا......کسی نامعلوم نمبر سے میسج تھا جس کے ردِعمل میں اُس نے بھی میسج بھیج دیا۔

اُس نے کاغذ سیدھے کئے اور لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ذہن الفاظ ترتیب دینے سے قاصر تھا......دماغ پر ایک تہہ سی جمتی محسوس ہوئی تھی......اُسے بے حد تھکاوٹ ہونے لگی......کئی دنوں سے سوچے سارے کردار گڈمڈ ہو گئے......کہاں سے لکھنا شروع کرے......دماغ پر جیسے قفل پڑ چکے تھے......کافی دیر قلم ہاتھ میں گھماتا رہا کچھ سجھائی نہ دیا......سفید کاغذ اس کی تحریر کے منتظر مگر قلم کی نوک کچھ بھی کہنے سے اجتناب برت رہی تھی......وہ خیالات کے بھنور میں ہچکولے کھانے لگا......جہاں دُھند ہی دُھند تھی......لفظ پھسل رہے تھے......جملہ بن نہیں رہا تھا......الفاظ اجنبی محسوس ہونے لگے تھے جیسے اُن سے کوئی شناسائی ہی نہ تھی......اِسی کشمکش میں اُس نے کاغذ قلم سامنے میز پر رکھ دیئے۔

آج وہ جملے ترتیب دینے سے قاصر تھا...... وہ جملوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا......مگر اُسے اپنا دماغ سفید کاغذ کی طرح لفظوں سے خالی محسوس ہونے لگا......وہ اُٹھا اور سامنے الماری میں رکھی کتابوں میں سے کتاب ڈھونڈنے لگا......کافی تلاش بسیار کے بعد بھی ناکام رہا......کتابوں پہ نظر ڈالے وہ اُس کتاب کا نام یاد کرنے لگا......اچھا بھلا نام تھا مگر یاد نہیں آرہا تھا......وہ بھول چکا تھا کہ وہ کتاب الماری کی بجائے اس کے ڈرائنگ روم میں پڑی ہے......اُس نے سامنے پڑی کتاب اٹھائی اور صفحات پلٹنے لگا......وہ چت لیٹے کبھی کتاب تو کبھی چھت پر نظریں ڈالے......کچھ سوچنے لگا......خیالات کا تانابانا جڑتے ہی اُس کے جسم میں عجیب سی لہر اُبھرنے لگی......اُس نے دانستہ اپنی توجہ ان الفاظ پر مرکوز کر دی۔

اچانک اس کے ذہن میں لفظ لوٹنے لگے......محبت...... چاہت ......خودکشی......
خوف......بھوک......ڈر......دُھند......آسودگی......اضطراب......بیتابی......بےچینی۔

وہ چونک کے اُٹھ بیٹھا......ہاں......وہ لفظ بھوک تھا......بھوک کا لفظ زبان پر آتے ہی اُسے اُلجھن سی ہونے لگی شائد بھوک ستانے لگی تھی مگر وہ لکھنا چاہتا تھا......ایک عرصے سے اس نے لکھنا چھوڑ رکھا تھا......اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا لکھے؟؟......کیوں لکھے اور کس کے لئے لکھے؟

اُس کا شمار معاشرے کے پس ماندہ اور غریب طبقے میں ہوتا تھا......تاہم سفید پوشی کا بھرم قائم تھا......وہ ایک چوبیس پچیس سالہ غیر شادی شدہ نوجوان تھا......پڑھا لکھا مگر غریب۔کچھ دنوں سے وہ اُلجھا ہوا تھا عجیب سی کشمکش کا شکار اسی وجہ سے وہ کچھ بھی لکھنے سے قاصر تھا......وہ ایک مقامی اخبار میں کالم نویسی کرتا تھا......اُس کے اکثر کالموں کے موضوعات پسماندہ طبقے کے مسائل ہوتے تھے......آج کل اسکا ذہن کسی بات پر جمتا ہی نہ تھا......وہ پھر سے بھوک بارے سوچنے لگا۔
بھوک کی وجہ سے خودکشی کرنا......؟؟؟وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

اُسے شرجیل یاد آ گیا......جس کا اکثر گھر میں جھگڑا رہتا تھا......غربت تو نہ تھی مگر وہ عجیب سی اُلجھن کا شکار تھا جو اُسے بہت ستانے لگی تھی وہ اچانک آپے سے باہر ہو جاتا پھر اُس کا دوست اُسے سامنے والی دکان کے پچھواڑے میں لے جاتا وہ سارا دن وہاں ہی گزار دیتا......والد اُن کے پیٹ بھرنے کی خاطر دن رات محنت میں جتا ہی رہتا تھا......اس دن شرجیل نے زمین پر سر مار مار کر خود کو خون میں لت پت کر دیا تھا......اس کی ماں اُسے پکڑنے لگی مگر ناتواں عورت جوان بیٹے کو کیسے قابو کرتی......پھر اسی حالت میں وہ اُٹھا اور خود کو آگ لگا دی......ماں کی چیخ و پکار سن کر محلے والے دوڑے آئے مگر اس وقت تک شرجیل کافی جھلس چکا تھا......آگ بجھائی گئی اور اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا......سورج ڈھل چکا تھا......جب خبر آئی کہ وہ چل بسا......ہر شخص سوگوار تھا......ماں سے تعزیت کرنے والے جب شرجیل کی بابت بات کرتے تو وہ بے چاری جواب دیتی شرجیل بے روزگاری کا شکار تھا......کسی کام پر لگ جاتا تو خود کو سنبھال پاتا......تعزیت کرنے والے دعائے مغفرت کے بعد صبر کی تلقین کرتے۔

پھر نازیہ اُس کی خیالوں میں در آئی......شور و غوغا برپا تھا......چیخ و پکار نے ہر کان کو اپنی جانب متوجہ کر لیا......کئی محلے دار عورتیں بھاگم بھاگ ان کے ہاں پہنچ چکی تھیں......وہ کافی برتن توڑ چکی تھی......اب کے وہ اپنے بال نوچ رہی تھی......گریبان چاک چہرہ غصے سے لال......جسم

تھرتھرائے جارہا تھا......والدہ اُس کے برہنہ جسم پرچادر ڈالتی تو وہ اتارکر دُور پھینکتی......نا زیہ پڑھی لکھی......باشعوراورایک ذمہ دارلڑکی تھی......پینتیس کے پیٹے میں تھی......چھوٹے بہن بھائیوں اوروالدین کی واحد کفیل......ایک پرائیویٹ کمپنی میں بطوراکاؤنٹنٹ اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی......چھوٹے بہن بھائی تعلیم حاصل کررہے تھے......گھرکانظام بھی اچھا چل رہا تھا۔

پھرایسا کیوں......؟؟؟ محلّہ دارعورتوں نے دبے لفظوں میں کہنا شروع کردیا......سایہ ہے......پھراُسے مختلف عاملوں کے پاس لےکرجاتے رہے۔

دم درود......تعویز......دھونی......فال سب ہوا......مگرکوئی افاقہ نہ ہوا......ڈاکٹر نے سکون آوراودیات کے استعمال پہ لگارکھا تھا......نازیہ نے ماں سے اُلجھتے ہوئے کہا تھا میں بیٹی ہوں......گھر کے افراد کے پیٹ بھررہی ہوں مگرمیری کسی کو پرواہ نہیں......چند دنوں بعد اُس نے زہرکھاکرخودکشی کرلی تھی......تعزیت کرنے والوں نے موت کو آسیب کا شاخسانہ قراردیا۔

نجانے کیوں؟؟؟ اندھیرا چھاتے ہی وہ بھی وحشت زدہ سا ہوجاتا تھا......جسم میں عجیب سی اُلجھن محسوس کرتا......وہ اُسکی دیوانگی ختم کرنے کے لئے کمرے میں قید کردیتے۔

مگر......شائد......وہ یہ نہیں جانتے کہ وحشت قید سے کم نہیں ہوتی......اس کے لئے تو انھیں اسکے خیالات اورمحسوسات کوقابوکرنا ہوگا......روشنی لباس بدل رہی تھی......سفیدی نے سرخ اوڑھنی اوڑھ لی......قدرے بعد نیلاہٹ نے سب سیاہی میں بدل دیا......ہرشہ کو سیاہی اپنے دامن میں سمیٹنے لگی......فضاء میں اڑتے پرندوں کی آوازوں میں اضطراب تھا......وہ اپنے آشیانوں کی جانب پلٹنے لگے......شائدوہ بھی اُلجھن کا شکار تھے۔

سامنے مکان کے کمرے میں بیٹھی نازک اندام بھی اُلجھن کا شکار تھی......دبلے پتلے مرد سے کہہ رہی تھی تم نے تو میری زندگی تباہ کردی......وہ آئیں بائیں کرنے لگا......وہ روتے ہوئے بےمحابا کہہ رہی تھی......تمھیں تو یاد ہوگا جب میرے گھر میرا ہاتھ مانگنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا تو میں تم سے تمہارا جواب طلب کررہی تھی......تم نے ساری زندگی مصاحبت کی قسمیں کھائیں اورکہنے لگے ''تم آئینے کی طرح صاف شفاف اورچمکدار شخصیت کی حامل ہولہٰذا آئینے کی طرح مضبوط ارادے کو بھی اپنالو'میں کہتی''آئینہ تو بےحد کمزور ہوتا ہے......ہلکی سی ٹھوکر سے کرچی کرچی ہوجاتا ہے'تو تم نے کہا تھا''آئینہ ارادے کا پختہ ہوتا ہے جو بھی سامنے آئے اُسے 'منعکس' کردیتا ہے......''میں تو بےحد کمزورتھی مگرتم نے میرے ارادے کو غیرمتزلزل بنا کر مجھے طاقت بخش دی تھی......آج......آج میں ٹوٹے آئینے کی سی مانند ہوگئی ہوں......مگرمنعکس کرنے کی

طاقت اُسی طرح رکھتی ہوں جس طرح آئینے کی کرچیاں .....ٹوٹ کر بھی اپنی بات پہ مُصر رہتی ہیں .....مجھے جینے کا یہ ڈھنگ اور میری سوچ کو یہ رنگ تم نے ہی تو دیا .....مگر تم نے اپنی زندگی میرے بغیر ہی مکمل کر لی۔

وہ شکوے کر رہی تھی .....وہ جواب نہ پا کر محبت کی قسمیں کھانے لگا.....چھوڑو قسمیں نا کھاؤ.....مجھے جھوٹ اچھا نہیں لگتا.....بتاؤ کیا ہم اب مل پائیں گے؟؟؟؟

نہیں .....کبھی نہیں .....شاید کبھی بھی نہیں .....وہ گردن نہوڑائے کہنے لگا.....تم میرے پاس تو چند گھڑیوں کے لیے آتے ہو پھر مجھ سے دُور چلے جاتے ہو وہ محبت بھرے لہجے میں کہنے لگی .....شاید پرانے آئینے کی طرح اب مجھ میں وہ چمک دمک اور خوبصورتی نہیں رہی .....جو پہلے کبھی ہوا کرتی تھی .....دُبلے پتلے نے اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا.....وہ اپنا آپ اس کے سپرد کر کے خوش تھی ..... چڑھتی پھولتی سانسوں میں پھر سے عہدو پیمان ہونے لگے.....وہ عورت بھی کسی اُلجھن کے زیرِ اثر تھی .....رات سامنے والے پڑوسی کو بلا رکھا تھا وہ خوف زدہ لہجے میں کہنے لگا اگر وہ آ گئے تو؟؟؟ .....وہ.....وہ اب صبح ہی آئیں گے اُس نے اپنے ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا.....وہ گھبرا رہا تھا..... خدارا تم نہ گھبراؤ .....میں ایک عرصے سے اُلجھی ہوئی ہوں ..... مسلسل آگ میں جل رہی ہوں اِس تپش کو کوئی نام نہیں دے پائی ..... جب سے تم ملے مجھے کچھ ڈھارس بندھی۔اب تم تو میرا سکون غارت نہ کرو.....دیکھو تمھارا خاوند ایک شریف اور محنتی آدمی ہے سارا سارا دن اور کبھی کبھار رات بھر کام کرتا ہے .....نجانے کیوں وہ اُسے سمجھانے لگا تھا.....بس بس .....مجھ پر کیا احسان کرتا ہے اُسے گھر بھی تو چلانا ہے اَب کے وہ طیش میں تھی .....پڑوسی کے چہرے پہ آزردگی سی چھا گئی دیکھو مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا .....اوہو.....تو پھر تم آئے کیوں؟؟؟ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ قدرے غصے میں کہنے لگی کمزور مرد عورت کی سب سے بڑی بدنصیبی ہوتی ہے اب چھوڑو بھی عورت نے اُسے اپنی جانب کھینچا پھر دونوں ہی دنیا سے آزاد ہو گئے .....عقبی محل نما کوٹھی میں مالکن نے ڈرائیور کو بلا یا رکھا تھا وہ بار بار پوچھ رہا تھا مالکن کب جانا ہے وہ اُسے کہہ رہی تھی کہ میں کپڑے بدل لوں تو چلتے ہیں .....صاحب دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں .....ساتھ سہیلی کو بھی لے جانا ہے تب تک وہ بھی آ جائے گی۔پھر نہ تو کوئی آیا اور نہ کہیں جانا ہوا.....اُس نے بہت کہا مالکن .....میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے.....پھر جلد ہی وہ بھی بہک گیا .....سڑک پر کھڑے چند لوگ کسی گاڑی کے انتظار میں اُلجھن سے دو چار تھے .....جو انھیں منزل تک لے جائے .....دوسری جانب رات کو فیکٹری میں کام کرنے والے بھی کھڑے

تھے ...... جب کوئی گاڑی ان کے پاس سے گزرتی تو وہ اسے رکنے کا اشارہ کرتے پر آج ساری گاڑیاں مسافروں سے لدی لدائی تیزی سے گزر رہی تھیں ...... جب گاڑی بغیر رکے نکل جاتی تو ان کے چہرے پژمردہ اور بجھے بجھے دکھائی دیتے ......سامنے بڑی کوٹھی کے پیچھے چھوٹے گھر میں بچے بھوک سے بلک رہے تھے ......ماں بچوں کو بہلاتے ہوئے بھی اُلجھی دِکھ رہی تھی ......بچوں نے ماں سے نئے لفافے جو ابھی کسی حد تک گیلے تھے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے ......ماں کے ہاتھ بچوں کو لفافے تھمانے کے بعد اتنے خالی تھے جتنے اس گھر کے مکینوں کے پیٹ ......پھر تینوں بہن بھائی تیز قدموں بازار کی جانب چل پڑے ......وہ ایسی تیزی سے چل رہے تھے جیسے بھاگ رہے ہوں کئی بند دکانوں پر نظر ڈالے آگے بڑھے جا رہے تھے ......وہ ہوٹل کے بالکل سامنے والی بیکری میں داخل ہوئے ......سیٹھ شکیل الرحمٰن کی کوٹھی پر قمقمے جگمگ جگمگ کر رہے تھے ......رات بھر شمعیں جلتی رہیں سارے نوجوان مختلف نغموں پر خوشی سے جھومتے رہے ......شادی پر مدعو مہمانوں نے زرق برق پوشاک پہن رکھے تھے ...... زمین سے قدرے اُونچی جگہ پر دولہا دولہن مدعو مہمانوں کی جانب تکتے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے جبکہ سامنے بیٹھے مہمان باری باری کیمروں کی نظروں کے سامنے سلامی دے رہے تھے ......چھوٹی بڑی نئی پرانی گاڑیوں کی قطاریں کوٹھی کے سامنے کے میدان میں ترتیب دی جا رہی تھیں ......ریشمی کپڑے سے مزین صوفے مخملی کپڑے سے ڈھکی کرسیاں اور وسیع میدان مہمانوں سے کھچا کھچ تھا ......چند جام وساغر کے رسیا اپنی الگ محفل سجائے ہوئے تھے ......کوٹھی کی پچھلی جانب اربابِ نشاط نے اپنی سحر بھری آوازوں سے اہلِ محفل کے دل جیت کر اپنے جیبیں بھر لی تھیں ...... پوری رات بانسری کی آواز اور طبلے کی تھاپ پر رقص ہوتا رہا جبکہ دوسری جانب نوجوان لڑکیاں باری باری اپنے فن سے بھی اپنی ہم عصر سہیلیوں کو ششدر کرتی رہیں ......کوٹھی کے بائیں جانب دولہا کے ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد اور چچا زاد آسمان کی جانب گولیاں برساتے رہے ......شور وغل میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ......دُولہے کے دوست مدہوشی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے ......رات کے کھانے پر تمام افراد کھانوں کی کئی انواع واقسام سے مستفید ہوئے تھے ......ان میں بھی کئی اُلجھن اور کئی بسیار خوری کا شکار ہوئے ......بعضوں نے جو کھایا الٹ دیا......کھانے کے بعد بچ جانے والی خوراک گندگی کے ڈھیر پر پھینکی جا رہی تھی ......بازار میں پولیس گشت کر رہی تھی ......اُن کا ایک جوڑی دار سامنے کوٹھے پر ناچنے والی سے جا اُلجھا ......اُس کے منہ سے تیز بو آ رہی تھی وہ اپنا عہدہ بتا کر بھبکی دے رہا تھا ...... وہ لڑکی بھی اُلجھن کا شکار تھی اُن دیکھے کھنچاؤ نے اُس کے دماغ کو جکڑ رکھا

تھا سوچنے سمجھنے کی حِس سے بے نیاز وہ اِس شدت کو کم کرنے کے لیے باؤلی ہوئے جا رہی تھی ......وہ بے حد مضطرب تھی یا شاید اُس نے اضطراب کو اپنے اُوپر حاوی کر رکھا تھا......اُس سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی......؟؟؟ ہم دکان میں کپڑے کی نئی ورائٹی دیکھ رہے تھے وہ بھی وہاں موجود تھی ......وہ سامنے پھیلے مختلف رنگ کے کپڑوں کو پوروں سے مَسل رہی تھی ......پھر ایک دن جب میں دُوست کو ملنے اُس کے فلیٹ پہ گیا تو وہ بھی وہاں موجود تھی ......میں اُسے وہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا......اُس دن وہ بے حد پُرسکون دکھائی دے رہی تھی ......دُوست نے باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ وہ تنہائی کا شکار ہے اِسی لئے کبھی کبھار اُسے ملنے فلیٹ پہ آجاتی ہے......مختلف موضوعات پہ گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں ...... کچھ ماہ قبل بڑے کمیٹی ہال میں ایک خاکہ پیش کیا گیا تھا جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہم کیوں الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں ......وہ حسد ،بغض، معاصرانہ چشمک ،غربت ،ناقص خوراک اور تعلیم کے فقدان کو اس کا سبب گردان رہے تھے ......کچھ معاشرے سے بھوک کے خاتمے پر زور دیتے نظر آئے ......اُسی پروگرام کے آخر میں خون کے عطیات کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا تھا......تازہ خون چاہئے تھا جو بیماریوں اور فاسد مادوں سے پاک ہو مگر بھوک نے سب کو نڈھال کر رکھا تھا......اِس جانب سوچنے سے سبھی کوسوں دُور تھے ......سب اپنی بھوک ختم کرنے کی سعی کر رہے تھے مگر بھوک تھی کہ مزید تیز ہوئے جا رہی تھی ......پروگرام کے خاتمے پر چائے اور لوازمات کا جو حشر ہوا وہ بھی قابلِ دید تھا ......وہاں ایک جوڑے نے اپنی برسوں کی بھوک ختم کی تھی۔

اقتدار کی لڑائی ......اَنا کی تسکین ......کسی علاقے میں اپنی اجارہ داری......سب اُلجھنوں کی کارستانیاں اور بھوک کا کیا دھرا ہے۔

ایران عراق جنگ کی تباہی کو کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک اَب سامراجی طاقتیں دیگر ممالک میں اپنا اثر رسوخ بڑھانے اور ان کے وسائل پہ آنکھیں سرخ کیے ہوئے تھیں۔

شاید سب بھوکے ہیں اور اُلجھنوں کا شکار ہیں ......بس بھوک اور اُلجھن کی نوعیت الگ الگ ہے۔

کشمیر پہ قبضہ ہو یا بوسنیا میں قتل عام ......کویت پہ شب خون ہو یا کہ عراق کے وسائل کی کھینچا تانی ......افغانستان پہ چڑھائی ہو کہ شام میں فسادات ......برما میں مسلمانوں کی نسل کُشی ہو یا مصر کے اندرونی حالات کی خرابی ......سب کی وجوہات مشترک ہیں ......اُس نے کتاب بند کی اور سر تکیے کے نیچے دبا لیا ...... تکیے کے نیچے سے بھی اس کی نگاہیں کتاب پر مرکوز تھیں......وہ

ٹکٹکی باندھے کتاب کو دیکھتا رہا...... کتاب کے ساتھ پڑے ریموٹ کو اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا......وہی تبصرے، وہی بحثیں، وہی دلائل...... جنہیں سن سن کر کان پک چکے تھے...... نجانے یہ چینلز مسلسل ایک ہی بات کو کیوں دہراتے رہتے ہیں؟؟ اُس نے چینل بدلا اور مسلسل بدلتا ہی چلا گیا...... ہر چینل پر وہی شور وغوغا پا تھا...... کسی کو بھی اِس بھوک کی فکر نہ تھی...... ملک کے مختلف حصوں میں قتل...... خودکشی...... اغوا برائے تاوان...... بم بلاسٹ، گینگ ریپ کی خبریں نشر کی جارہی تھیں...... اُسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی ٹی وی بند کردیا اور دوبارہ کتاب اٹھالی...... وہ کتاب کے ورق ٹی وی چینلز کی طرح جلدی جلدی پلٹنے لگا...... اس شغلِ بے کار سے بھی وہ جلد ہی اُکتا گیا...... اُس نے بھوک بارے دوبارہ سوچنا شروع کردیا...... کیا یہ بھوک اتنی شدت رکھتی ہے کہ ایک انسان خودکشی جیسے اذیت ناک عمل تک پہنچ جائے اُس کے سامنے خودکشی کا عمل گھومنے لگا...... معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج اور مادہ پرستی پر اُسے ابکائیاں آنے لگیں...... اُسے وحشت سی محسوس ہونے لگی...... وہ معاشرے میں پھیلے رسم و رواج پر کڑھنے لگا...... اُس کی اپنی بھوک میں مسلسل اضافہ ہونے لگا...... اُس کے باورچی خانے میں کھانے پینے کے لوازمات موجود تھے مگر بھوک پھر بھی اسے باؤلہ کئے جارہی تھی...... اُسے رہ رہ کر اپنے پڑوسی پہ غصہ آنے لگا تھا...... یہ سوچتے ہی ایک بار پھر دماغ خالی کاغذ کی طرح محسوس ہونے لگا...... اُس نے دانستہ بھوک بارے سوچنے سے اجتناب کرلیا...... قلم اٹھایا اور لکھنے کی کوشش کرنے لگا...... کیا لکھنا چاہئیے...... خودکشی، ڈر، بھوک، بم بلاسٹ، اغواء برائے تاوان نہیں نہیں...... وہ لوگوں کو کیوں اُلجھائے جو پہلے ہی اُلجھنوں میں پھنسے ہیں۔

اُس نے محبت بارے لکھنے کا فیصلہ کیا...... محبت کیا ہے......؟؟...... ایک سحر...... یہ تو جھوٹ ہے کہ محبت ایک ہی بار ہوتی ہے یہ تو ایک نشہ ہے جو بار بار ہوسکتا ہے اور ہر بار اس کا لطف عجیب تر ہوتا ہے......ہاں......وہ حسن و جمال کا شاہکار تھی جس نے اُسکی روح تک کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا اُسے سارے پھیکے رنگ اچھے لگنے لگے تھے...... صبح شام، ایک مسحورکن غیر مرئی خوشی اسکے وجود میں دوڑنے لگی تھی...... وہ بہت خوبصورت تھی جو بھی پہنتی اُس پہ جچتا تھا وہ اُسکے پرنور چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا...... جونہی نظر چہرے سے اس کے نئے سفید بے داغ لباس پر پڑی تو وہ اس کے کردار بارے سوچنے لگا...... ماضی کے بیتے لمحات فلم کی طرح اسکے سامنے چلنے لگے تھے وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالکہ تھی......اُس کے نپے تلے الفاظ دل میں اتر کر روح تک کو ہلا دیتے تھے...... محبت ایسا سرور ہے جو زندگی میں پراسرار جذبے کی طرح در آتا ہے...... الفاظ کا ہیر پھیر بن اس

جذبے کو نہیں پہنایا جا سکتا یہ محسوسات کی دنیا ہے جس میں احساسات اوڑھنا بچھونا بن جاتے ہیں ......بے کیف راتیں پُرکیف اور زندگی ایک سمت متعین کر کے رعنائیوں اور لطافتوں سے بھر جاتی ہے......اُس سے پے در پے ملاقاتیں ......ہر ملاقات میں وہ سوچتا کہ اُس کی جانب دیکھے یا اس کی باتوں پہ توجہ دے......خط وخال کا جائزہ لے یا الفاظ کی مٹھاس کو چکھے ......اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے گرد خوشبوں نے ہالہ کھینچ دیا ہو......وہ ایک جذباتی لڑکی تھی ہر شہ کو صرف دل کی آنکھ سے دیکھتی تھی ......اُسے اپنی ذات میں تو کوئی فسوں گری دیکھائی نہ دیتی تھی پر وہ تو حسن وجمال کا شہکا رتھی ......وہ ایک ایسی ضخیم کتاب کی مانند تھی جس کے الفاظ فصیح اور جملے بلیغ تھے اُسے آسانی سے پڑھا تو جا سکتا تھا مگر سمجھنا بہر حال مشکل تھا۔

جس عورت کو رب ذوالجلال نے حسن کا جلال اور الفاظ کا استعمال عطا کر رکھا ہو جس کو آنکھوں سے چھو کر دل میں اتارا جائے ......جو اپنی ایک ایک ادا میں کئی باب رکھتی ہو ایسے شاہکار پر لکھتے ہوئے الفاظ ذہن سے ماؤف اور سیاہی بخارات بن کر زائل ہو ہی جاتی ہے ......وہ ایک گلاب تھی جس کی ایک ایک پتی میں کئی رنگ سمائے ہوئے تھے ہر پتی اُپنے اوپر اظہار چاہتی تھی ......اُس کا حسن صرف اس کی سیاہ گہری زلفوں میں ہی نا تھا بلکہ ان زلفوں میں گرے گول چہرے میں بھی تھا جو نازکی اور معصومیت سے لبریز تھا اُس کا پاس ہونا سوچنے پہ مجبور کر دیتا تھا کہ وہ ایک ننھا سا پودا ہے جسے وہ اپنی سیاہ زلفوں کے حصار میں لیئے تیز روشنی سے بچائے پروان چڑھا رہی تھی وہ سفید رنگت، سیاہ زلفیں، چھریرا قد رکھنے والی دوشیزہ تھی جب وہ سیاہ کپڑے زیب تن کرتی تو چاند کی مانند دکھائی دیتی ......اُس کی گہری سیاہ آنکھیں، چمکتے دانت، توجہ کا مرکز بنے ہوتے تھے ......ایک دکھ اِس کا تھا اور ایک غم اُسکا دونوں اپنے اپنے سرمائے کے ساتھ خاموش ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے......اُس دن وہ جلدی جانے کا متمنی تھا اور وہ اُس کے رک جانے پہ بضد تھی ......وہ اُسے سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا سیاہی نے ہر شہ کو اپنی آغوش میں لے لیا......کہیں ہماری محبت کو بھی سیاہی نا کھا جائے ......آسمان پر چمکتا چاند، ٹمٹماتے تارے، رات کے سحر میں اضافہ کر رہے تھے وہ اِس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنے لگی ہماری محبت سیاہی سے کبھی مات نہیں کھا سکتی یہ اندھیرے ہمیں چت نہیں کر سکتے ......اس لمحے وہ اپنے الفاظ پر شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا ......وہ باتوں میں ہمیشہ اُس سے مات کھا جاتا تھا......وہ کم بولتی تھی مگر اس کے الفاظ میں کسی فلسفی کی طرح گہرائی اور گیرائی ہوتی تھی ...... جب اُس نے اپنی انگلیوں سے اِس کے چہرے کو مس کیا تو ایک سرد سی لہر اس کے جسم میں کوند گئی تھی ......اُس نے

محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُسکے ہاتھوں پر بھوسہ دیا تھا اُس لمحے کے محسوسات اُس کے دل ودماغ کو معطر کر گئے تھے ...... وہ کہتا تھا کبھی کبھی ساعت اپنے اندر صدیاں سمیٹ لیتی ہے ......کاش وقت تھم جاتا اور روز ازل بپا ہو جاتا ایک نا ختم ہونے والی دنیا کے ہم باسی بن جاتے ......وہ اکثر ہم کلامی کرتے ہوئے کہتا تھا ......سنو ......میں آج بھی تمھیں ڈھونڈ رہا ہوں ......میرا وجدان نت نئی کائنات کا کھوج لگاتا ہے ......وہ محبت جس نے ہماری زندگی میں اُمید کی کرن پیدا کی ......میری اسیر روح پر کئی دروازے وا کیئے ...... میں جو یاس سے لبریز خود کو قفس کا اسیر سمجھتا تھا......تم نے اپنی محبت سے میری روح کو ارفع کر دیا......اچانک اُس کے کمرے میں کچھ آن گرا تھا ......اُس نے صفحے سے نظر ہٹائی سامنے ایک کاغذ پڑا تھا ......اُس سے پہلے کے وہ اس کی جانب لپکتا اس کی نظر سامنے لگے آئینے پر جا ٹکی ......اُس نے اپنے چہرے کو غور سے دیکھا اس کی بجھی آنکھوں میں قدرے چمک تھی مرجھایا چہرہ پھول کی مانند کھلا ہوا تھا رنگت جو کسی بوسیدہ کپڑے کی طرح مردنی سی تھی یکسر بدل چکی تھی ......اُس نے سامنے پڑے کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اس کی نظر سامنے والی عمارت پہ جا ٹکی مگر وہاں کوئی نا تھا ......اُس نے کاغذ کا ٹکڑا کھولا اس میں لکھا تھا میں معاشرے کے رسم ورواج پامال نہیں کر سکتی ......ہمارے بیچ جو ہو چکا سو ہو چکا ......میں کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تمھیں سب صاف صاف بتا دوں پر ہمت نہیں بندھ رہی تھی آج سوچا کہہ ہی دوں ......سنو ......زندگی خوبصورت لفظوں اور سہانے خوابوں کے سہارے نہیں گزر سکتی ......میں نے صرف تم سے محبت کی ہے اور دِل سے چاہا ہے کہ صرف تمھاری بنوں ......میری تو خواہش تھی کہ ہم ایک ہو جائیں پر شائد یہ ممکن نہیں ......میری منگنی ہو رہی ہے ......آئندہ میں تم سے مل نہیں پاؤں گی اپنا بہت خیال رکھنا......خدا حافظ۔

ابھی پچھلی رات کی ملاقات کا نشہ بھی نہیں اترا تھا کہ اس کے اندر تصادم سنگینی اختیار کرنے لگا وہ خود کو جھنجھلاہٹ سے نوچ دینا چاہتا تھا......مختلف واقعات اس کی سامنے جھلملانے لگے قدرے سوچنے کے بعد وہ زیرِ لب مسکرانے لگا ......اس نے فون سیل اٹھایا اور نمبر ڈائل کیا دوسری جانب سے نسوانی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی ......رات کھانے سے فراغت کے بعد کافی دیر تک وہ ایک کمرے میں رہے اِس دوران جسم جسم کا ہم راز بنا رہا......اس کی گردن کی نسیں قدرے ابھر گئی تھیں ......ہاتھ اکھڑ چکے تھے......آنکھوں کے سامنے چھریرا بدن اپنی رعنائیوں کے ساتھ بازوں کے حلقے میں سمٹ کر سینے میں ٹھنڈک کا سماں پیدا کرتا رہا ....تھرکتا، چھلکتا، سفید بدن آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا......رس بھرے ہونٹ نم سے ہو چکے تھے ......جسم

کی تپش ماتھے سے پسینے کی صورت نمودار ہوئی ہونٹوں میں سرخی اور وجود میں حدت محسوس ہونے لگی ......رخساروں،ہونٹوں،اور پھر گردن پر اس کے کئی نشانات ثبت ہو چکے تھے ......دونوں ہی مستی کے عالم میں پوری طرح محو رہے تھے اس قدر مخمور کے دنیا سے بے نیاز با ہم ایک جان دو بدن ......وہ اُسے اپنے ساتھ بھینچ کر کہنے لگی میں اُس وقت تم کو دیکھا کرتی تھی اور اکثر تمھارے فون پہ میسج کر کے تم سے کہتی بھی رہی تھی پر تم مان نہیں رہے تھے ......تمھارے پیار کا انداز مجھے بہت پسند تھا کاش وہ وقت جو تم نے اُس کے ساتھ گزارہ ......میرے ساتھ گزارہ ہوتا ......آج میری الجھن ختم ہوئی ......مجھے قرار نصیب ہوا میرے اندر کا اضطراب اپنے انجام کو پہنچا۔

مگر تمھارا خاوند......؟؟؟

اِس وقت اُس کا نام لیکر سارا مزا کرکرا نہ کرو۔ وہ یہاں سے دُور بہت دُور ضروریات اور خواہشات کی تکمیل میں جتا ہوا ہے۔تم اُلجھن میں کیوں پڑ رہے ہو......جو کچھ مل رہا ہے کیا تمھارے لئے کافی نہیں۔وہ خود کشی،بیتابی،بے چینی،اضطراب،اُلجھن،ڈر،دُھند،آسودگی، بھوک اور محبت بارے سوچنے لگا۔

پھر سارے الفاظ نجانے کہاں چلے گئے اُسے اپنا ذہن سفید کاغذ کی مانند محسوس ہونے لگا۔نئی منزل پا لینے کا خیال اُسے خوش کرنے کے بجائے مضطرب کرنے لگا......اُسے خود سے غلیظ سی بدبو آنے لگی......جس سے طبعیت میں بے چینی سی پھیلنے لگی۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے تا حدِ نظر دُھند ہی دُھند تھی۔وہ نجانے کیوں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا تھا۔تب اُس نے ساری غلاظت یک بارگی قے سے باہر نکالی جو وہ عرصے سے پی رہا تھا۔

دائروں میں بٹی زندگی

میں بازار سے گزر رہا تھا۔سامنے کھڑے ایک شخص نے آواز دی ......ارے بابو صاحب!ارےبابو صاحب!!

میں نے جب اُس کی طرف دیکھاتو وہ مجھے ہی آواز دے رہا تھا۔میں سمجھا میرے آگے چلنے والے کسی شخص کوصدائیں دے رہا ہے۔میں نے اپنے آپ کو چھوتے ہوئے اس کو اشارہ کیا۔ہاں ہاں!بابو صاحب آپ!میں اُس کی جانب چل دیا چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے اُس شخص کو میں نہیں جانتا تھا۔جب میں اُس کے پاس پہنچاتو اُس نے گرم جوشی سے میراا ستقبال کیا۔وہ مجھ سے کسی اور وقت ملنے کا متقاضی تھا۔

آپ مجھے کچھ وقت دیں۔

کیوں خیریت؟......میں نے استفسار کیا۔

میرا آپ سے ایک ضروری کام ہے۔اُس نے اس طرح کہاجیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

جی!فرمائیں میں سن رہا ہوں۔

نہیں بابو!اِس طرح تو نہیں۔میں آپ کے ساتھ بیٹھ کرایک گرم کپ چائے پیوں گا،پھر بات ہوگی۔

میں شش وپنج میں تھا کہ میں تو اسے جانتا ہی نہیں......یہ کون ہےاور مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے۔

مگر وہ مسلسل اصرار کئے جارہا تھا......میں نے بھی جان چھڑانے کی خاطر حامی بھرلی اور وہاں سے چلتا بنا۔

راستے میں سوچا شاید اُسے مغالطہ ہوگیا ہے.....دُوسرے دِن جب بازار سے گزر رہوا تو وہ پھر مجھے مل گیا۔
ارے بابو صاحب کیا حال ہے۔اُس نے آج کچھ زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔
الحمدللہ میں ٹھیک ہوں،آپ سنائیں کیسے ہیں؟میں جلدی میں نکلنے کی کوشش میں تھا۔
بس زندگی گزار رہا ہوں.....آپ سے سرراہ ملاقات ہوگئی میں آپ کو ملنے جلد آپ کے گھر آؤنگا۔
جی آپ مجھ سے مل جو رہے ہیں؟میں نے بےزاری سے کہا۔
نہیں بابو صاحب.....اِس طرح تو نہیں میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں گا پھر گپ شپ کا مزا بھی آئے گا۔
جی ٹھیک ہے!میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے راہ لی۔
چند قدم چلنے کے بعد میں سوچنے لگا آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے اب تو یقین ہونے لگا......اِسے کوئی شبہ دامن گیر ہے ضرور کسی اور کی تلاش میں روزانہ مجھ سے مڈبھیڑ کر بیٹھتا ہے.....چند دن مصروفیت رہی.....شہر میں کسی نامعلوم نے راہ چلتے بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا......دِلسوز واقعہ پر اہلیان علاقہ نےہڑتال کی کال دے دی......سوچا سودا سلف لے آؤں......ہڑتال کا کچھ پتا بھی تو نہ تھا اکثر ایک دِن کی ہڑتال کئی دِنوں تک بھی چلی جایا کرتی تھی......گوشت،سبزی،دودھ لینے بازار جانے کا قصد کیا تو وہ شخص میری سوچوں میں آن ٹپکا مگر یہ ضروری تو نہیں کہ وہ آج بھی ملے گا خود کو اس کے خیال سے واگزار کیا اور بازار چل دیا۔
جب سودا سلف لے چکا تو ایک مانوس سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی......ارے بابو صاحب......میں نے جو مڑ کے دیکھا تو وہ میرے طرف لمبے ڈگ بھرتا آ رہا تھا۔
میں نے لاحولہ ولاقوۃ پڑھا۔اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی جانب بڑھ چکا تھا۔میرے جی میں آیا آج فیصلہ کر کے ہی جاؤنگا۔
اسلام علیکم بابو صاحب!اُس نے پرجوش انداز میں بتیسی نکالتے ہوئے میرا استقبال کیا۔
وعلیکم اسلام!جناب اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں میں نے قدر ترش لہجے میں کہا۔
ارے بابو صاحب پوچھو۔۔۔مگر پہلے میری سن لوکل میں آپ کے گھر آجاؤں؟
کیوں خیریت؟میں نے ناگواری سے کہا۔

وہ کل بازار بندر ہے گا۔کام کاج تو ہو گا نہیں۔خوب گپ شپ ہوگی۔چائے بھی پئیں گے۔
مگر...... جناب! کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟ میں نے کرید۔تے ہوئے پوچھا۔
ارے بابو صاحب! آپ کو کون نہیں جانتا؟
مگر؟؟؟ میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ اُس نے میری، گلی، محلے اور مکان کا نمبر نقشہ تک بتا دیا۔مجھے یقین ہو گیا کہ اسے مغالطہ نہیں ہوا۔اِس کا مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔

بابو صاحب! کچھ سامان رہتا ہے میں فروخت کرلوں۔کل صبح حاضری دُوں گا۔
میں حیرانگی کی تصویر بنا چل دیا مگر راستے بھر سوچتا رہا کہ اس نے میری، گلی، محلے، مکان کی تفصیلات تو درست بتائیں۔نجانے اب یہ شخص مجھ سے چاہتا کیا ہوگا؟ اب مجھے قدرے فکر ہونے لگی۔نہ جان نہ پہچان تو میرا مہمان ......عجیب آدمی ہے......رات کھانے کے بعد جب میں اپنے بستر پر سونے گیا تو اس کا چہرہ اُس کا گرم جوشی سے مصافحہ کرنا یاد آنے لگی۔کچھ دیر خیالات میں بچکولے کھانے کے بعد اِس فیصلے پہ پہنچا......چلو جو ہوگا صبح پتہ چل جائے گا۔
صبح ناشتے سے فراغت کے بعد اُس کے بارے سوچا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔اتنی صبح صبح کون آسکتا ہے؟ پھر خیال آیا وہی ہوگا۔مگر اتنی صبح! نہیں نہیں۔ابھی وہ نہیں ہوگا۔ اِسی اثناء میں قدرے زور سے دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔میں تیز قدموں دروازے کی جانب بڑھا۔ چٹخنی کھولی۔سامنے وہی شخص کھڑا تھا۔
ارے بابو صاحب! اسلام علیکم!! اُس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔
وعلیکم السلام!۔۔۔کہتے ہوئے کافی غصہ بھی آیا، بھلا اتنی صبح آنے کی کیا ضرورت تھی؟
میں اندر آسکتا ہوں؟ اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔
ہاں ہاں! کیوں نہیں آجائیں۔میں نے بھی جواباً مسکراہٹ پھینکی۔
وہ میرے گھر میں داخل ہو گیا۔گھر کیا تھا؟ ایک کمرہ، چھوٹا سا سٹور جسے میں بعض اوقات کچن کے طور پر بھی استعمال کر لیا کرتا۔ساتھ میں ایک باتھ روم۔مالک مکان ہی مجھے کھانا تیار کر دیتے تھے۔وہ سامنے والی تپائی کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھا۔میں نے ایک طرف پڑی کرسی کھینچی اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔
وہ میرے کمرے کا جائزہ لینے لگا کچھ دیر خاموشی نے اپنے حصار میں لئے رکھا ......چند ثانیے وہ شش و پنج میں مبتلا رہا......مجھے لگا میرے مکان کی حالت دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا یا

شاید وہ کچھ کہنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔
بابو تو یہاں اکیلا رہتا ہے؟ اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔
جی ہاں ...... آپ کا مجھ سے کچھ ضروری کام تھا۔
اُس نے لمبی سانس لی اُفسردگی اُس کے چہرے پہ پھیل گئی ...... میں اِس تبدیلی کو نہ بھانپ سکا ...... میں نے گفتگو بڑھانے کی خاطر پوچھا ...... آپ نے مجھ سے کوئی اہم بات کرنی تھی وہ سامنے دیوار پہ نظریں گاڑھے سوچنے لگا ...... میں اتنی محویت دیکھتے ہوئے ...... سوال کرنے ہی لگا تھا کہ وہ کہنے لگا بابو صاحب ...... آپ کو ملنے آیا میں جانتا ہوں آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے ...... میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول پاؤنگا۔
میں نے سوچ لیا کہ یہ سبزی منڈی میں ریڑھی کے پاس ہمیشہ مجھے ملا شاید مجھے کوئی امیر فرد سمجھ کر امداد کا تقاضہ کرنے آیا جب میری حالت دیکھی تو افسردہ ہو گیا اب سمجھ نہیں پا رہا کہ مجھ سے کچھ مانگے یا چائے پیئے اور چلتا بنے۔
وہ مسلسل میرے وقت کے قیمتی ہونے کے ساتھ اپنی عزت افزائی پر میری مدح سرائی کئے جا رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگا کہ مقصد کی بات کرے اور جائے۔ میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہا چائے لے آؤں آپ نے کہا بھی تھا کہ گرما گرم چائے پہ گپ شپ کا خوب مزا آئے گا۔ میں باورچی خانے میں چائے بنانے چلا گیا۔ چولہے پہ چائے رکھ کر اُس کی بابت سوچنے لگا۔ شاید رقم ضرورت ہوگی۔ اگر اس نے رقم کا تقاضہ کر دیا تو اس سے میں کس طرح جان چھڑاؤں گا۔
کئی بہانے تراشے پھر سوچا وہ مجھ سے کیونکہ رقم کا تقاضہ کرے گا میں تو اُسے جانتا ہی نہیں ہوں۔ کونسی جان پہچان ہے کہ تقاضا پورا نہ کیا تو میری رسوائی ہوگی۔ سرے بازار کسی کو پکڑ کر چائے پہ مل بیٹھ کر گفتگو کا کہا جائے اور ساتھ رقم بھی اینٹھی جائے۔ پھر اس کا کام کیا ہوگا۔
میں نے دُو کپ چائے کے بھرے اور کمرے میں جا پہنچا۔ بابو صاحب ایک گلاس پانی ملے گا۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں نے پانی کا گلاس تھمایا۔
وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ مجھے اِس طرح اُس کا پانی پینا بہت ہی برا لگا۔ سامنے چائے کا پڑا کپ اٹھایا اور اُٹھتی بھاپ کو غور سے دیکھنے لگا۔
میں یقین ہو چلا کہ وہ ضرور مجھ سے رقم کا تقاضہ کرے گا۔ اب وہ صرف ان سوچوں میں غلطاں ہے کہ وہ کیونکر اور کس طرح مجھ سے رقم مانگے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا چکی

تھی۔وہ پیالی سے اُٹھتی بھاپ کو قدرے غور سے دیکھنے کے بعد چائے کی ہلکی سی چسکی لیتے ہوئے کہنے لگا۔

بابو صاحب! میرا سبزی منڈی میں ٹھیہ ہے۔میں اکثر آپ کو وہاں دیکھتا رہا ہوں چند روز قبل آپ سے ملاقات ہوئی ایک عرصے سے آپ سے بات کا سوچ رہا تھا۔

اَن پڑھ کیا جانیں پڑھے لکھے لوگوں کی قدر؟ پڑھے لکھے کی قدر تو وہی کرے گا جو پڑھائی لکھائی کرنے والوں کے مقام سے آگاہ ہوگا؟

ہاں یہ تو ہے میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے چائے کی چسکی لی۔

بابو صاحب! میں نے بڑی مشکل سے ایف اے کیا ہے۔پڑھنے کا بے حد شوق تھا مگر گھر کے حالات، بوڑھے والدین، جوان بہنوں کی ذمہ داری نے آگے پڑھنے نہ دیا۔

میں نے اب کے اُسے غورے سے دیکھنا شروع کیا وہ اپنے چہرے، کپڑوں اور چال ڈھال سے قطعی پڑھا لکھا نہیں لگ رہا تھا۔

بابو صاحب! معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں تو مارنے پڑتے ہیں۔ میں نے ایف اے کے بعد کئی محکموں میں نوکری کے لیے درخواست دی۔جب کچھ نہ بن پڑا تو سبزی منڈی میں پڑاؤ ڈالا بیس سال ہوگئے میں منڈی میں کام کر رہا ہوں۔بابو صاحب میں نے زندگی میں حلال کمانا اور بچوں کو حلال کھلانا ہی جائز سمجھا ہے بس۔میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اُسکی باتوں کی تہہ میں اُترنے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔ہاں۔۔ہوں۔۔ہوں جواب دے رہا تھا۔میری توجہ اِس بات پر مرکوز تھی کہ وہ کس طرح مجھ سے کچھ پیسے ادھار مانگے گا۔

بابو صاحب آپ ایک عرصے سے قلم اور قرطاس سے جڑے ہوئے ہیں۔میں نے آپ کی لکھی ساری کہانیاں پڑھی ہیں شاید ہی کوئی کہانی ایسی ہو جو میں نہ پڑھی ہو۔

ہوں!...... مجھے حیرانی سی ہونے لگی۔

بابو صاحب! میں روزانہ رات کو کچھ نا کچھ ضرور پڑھ کے سوتا ہوں، ورنہ مجھے نیند نہیں آتی۔وہ مختلف کہانیوں کے ناموں اور کرداروں پر بات کرنے لگا۔

"روتی عورتیں"......"کبوتر کی اڑان"......"آسمان"...... لپکتے شعلے"......"کچی بستیاں"......"خشکی تری میں چلتے مسافر"......"بند ہوتی راہیں"......"محبت میں سرشار جذبے"......"ٹوٹتی امیدیں"......"بنتے خواب"......"موت کے آغوش"......"صبح کی تازہ ہوا......"سر سے نکلتا ساز"......"تار تار ہوتے لباس"......"نئے بوشاک"......"پیاسی

چڑیا"......"ندی میں نہاتے بچے"......"دکھ کی رات"......"سکھ کی صبح"......"چلتی ریل"......"ماں کا بوسہ"......"بہن کی چاہت"----

وہ شاید اپنے بارے میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ کہانی کو سمجھتا ہے......اب وہ مختلف لکھاریوں کی کہانیوں پہ رائے دینے لگا......کئی لکھاریوں کے نام اور اُن کی مشہور کہانیاں بتائے جا رہا تھا......اُس کی ان باتوں کے پس پردہ اصل مقصد کیا ہیں......میں جان نہیں پا رہا تھا......کچھ دیر باتوں کے بعد یہ خیال رفو ہو چکا کہ وہ مجھ سے پیسوں کی مدد مانگنے آیا۔

وہ ایک خوددار شخصیت کا حامل فرد تھا......جس نے سردی، گرمی، بہار، خزاں، دن رات، صبح وشام، ہر ساعت ہر لحہ مشقت کی......رزق حلال سے اپنے کنبے کے پیٹ بھرے اور اپنی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش ہوا......میرے اصرار مجھے اور چائے بنانے کی رخصت ملی۔

اب کہ وہ بات کرنے کے بعد چائے کی چسکی بڑے ہی سلیقے سے لیتا۔نجانے کیوں مجھے اسکی باتیں اچھی لگنے لگیں۔جب چائے کا دُوسرا دُور بھی ختم ہوئے کافی وقت گزر گیا......میں اس کے لیے کھانے کی تیاری کیلئے کچن چلا گیا۔اب کی بار مجھے کوئی کوفت نہ تھی۔میں نے جلدی سے تین چار انڈے بنائے۔مالک مکان کی طرف سے میرا کھانا آ چکا تھا۔

وہ کہنے لگا---بابو صاحب! مجھے بھی کہانیاں لکھنے کا بڑا شوق تھا مگر ہر شوق پروان چڑھے یہ ضروری تو نہیں۔

آپ کچھ نہ کچھ لکھتے۔میں نے لقمہ دیا۔

کہاں بابو صاحب ایک اندھیرے گھر سے نکلتا ہوں تو دوسرے اندھیرے گھر میں داخل ہوتا ہوں مگر روزانہ کوئی نہ کوئی کہانی ضرور پڑھتا ہوں۔

بابو صاحب! آپ سے ایک درخواست ہے۔

ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟ بابو صاحب! میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہوں

ہا---ہاہا......تو کون ہے جو ہمیشہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔

ہاں مگر......یہ ایسی خواہش ہے جو کسی کی بھی پوری نہیں ہوتی۔بابو صاحب میں کوئی بڑا آدمی تو نہیں ہوں۔جو خود نوشت لکھوں۔جس کی کوئی مدح سرائی کرے۔جس پر لکھاری قلم اٹھائیں......صفحات سیاہ کیے جائیں۔میں تو بہت معمولی سا عام آدمی ہوں۔لیکن بابو صاحب! تم میرے ارمانوں پہ......میرے خوابوں پہ......میری مجبوریوں پہ......میرے دکھوں پہ......میری روتی ہوئی راتوں پہ، میری روح میرے جسم پہ، میری سوچ میری فکر پہ، میرے مسائل پہ، مجھ پہ،

کچھ لکھ دو۔ میں چاہتا ہوں لوگ مجھے بھی پڑھیں۔

دیکھ بابو! تو لکھتا تو ویسے بھی ہے؟؟۔کیا فرق پڑے گا جو تو مجھ پہ لکھ دے تو؟ بابو صاحب ...... میں بھی تو ایک کہانی ہوں ...... تیرے سامنے بیٹھی ہوئی کہانی ۔۔ انکار نہ کرنا بابو!۔۔ اُس کے بعد چہرے پہ مسرت اور یاس کے ملے جلے جذبات تھے۔

ایک پل مسکراتا چہرہ ، دُوسرے پل افسردہ نظریں ۔ایک ساعت پر امید باتیں، دُوسرے لمحے تاسف کرتیں سانسیں ...... میں اُسے سمجھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا ...... وہ مجھے غور سے تکے جا رہا تھا...... میں نے اُس پر لکھنے کی حامی بھر لی ...... وہ خوشی سے سرشار ہو گیا تھا

اچھا اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟ اُس نے آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا۔وہ عمر قید با مشقت کاٹنے والا کوئی قیدی ہے۔کبھی ایسے لگتا کہ وہ کسی ریل کا وہ مسافر ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں، بس کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔۔سفر کئے جا رہا ہے۔ کبھی یہ تاثر اُبھرتا کہ وہ معاشرے کی وہ چیخ ہے جو چلاتے چلاتے اپنے اندر ہی بھسم ہو کر ہی رہ گئی ہے تو کبھی یوں لگا ...... وہ صرف صبح شام گزارے جا رہا ہے۔۔۔پھر ایسا بھی گماں گزرا کہ وہ کسی ریاست کا بادشاہ ہے، جس کی ریاست میں ملکہ اور اُس کے شہزادے، شہزادیاں صرف اُسی کی چاہت میں جی رہے ہیں۔

اُس کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ ایک بیل ہے جو ایک دائرے میں سفر کرتے کرتے وقت کو پیچھے چھوڑے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔کبھی اس کی آشفتہ سری...... آشفتہ بیانی لگنے لگتی...... کبھی اُس کے چہرے میں اپنا آپ دِکھتا ...... آشنائی نبھانے کو جی کرتا ...... کبھی اُس کی باتیں آشوبِ زمانہ کا عکس معلوم ہوتیں ...... کبھی وہ اُمن و آشتی کا پیغام پھیلانے والا وقت کا پیغامبر نظر آتا ...... کبھی وہ زمانے کا نباض اِس دُور کا واعظ دِکھائی دینے لگتا ...... پھر ایسے بھی ہوا ...... کہ میں اُسے سرتاپا مسائل میں پھنسا ایک آدم سمجھنے لگا جس کا اوڑھنا، بچھونا مسائل کا حل اور ان سے جان خلاصی کے علاوہ کچھ نہ ہو۔

وہ اپنی روداد سنا کے جا چکا تھا ...... سامنے قلم اور قرطاس میرے انتظار میں تھے۔میں نے کاغذات درس کئے کہانی لکھنی شروع کی ...... جب کہانی ختم ہوئی تو مجھے لگا ...... ہم سب دائروں میں بٹے ہوئے ہیں ...... ایک دائرے کے بعد دُوسرا دائرہ ...... چھوٹا دائرہ بڑے دائرے میں اور بڑا ...... اُس سے بڑے دائرے میں مدغم ...... ہر دائرے کا رنگ اور ہیئت دوسرے دائرے سے یکسر مختلف ...... کوئی انا کے دائرے کا قیدی ...... کوئی اپنے اعلیٰ منصب کے اندر گم ...... کسی کو اپنی

دولت پہ گھمنڈ......کوئی اپنی طاقت کے نشے میں بدمست ......کوئی غربت اور افلاس کے شکنجے میں جکڑے دائرے میں تنا ہوا ......کوئی اُدھوری خواہشات کے گرد چکر لگاتے دائرہ در دائرہ سفر کے مصائب سے نبرد آزما......کوئی جاگتی آنکھوں دیکھے خوابوں کے پیچھے بھاگتا ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں جانے کو بے تاب ......کوئی اپنے اندر کے کرب کو چھپاتے ہوئے دائرے میں دیوانہ وار گھومے جا رہا ہے ......کسی کے چہرے کی کملاہٹ اُس کے اضطراب کو عیاں کر رہی ہے وہ دائرے کے خول سے تنگ اِس قید سے خلاصی چاہ رہا ہے ......دائرے آدم کو مختلف حصوں میں بانٹے اس کھیل سے محظوظ ہو رہے ہیں ......آدم دائروں میں بٹی زندگی میں ہی کہیں ......وقت کے تھپیڑے کھاتا ......منہ بناتا ......زخم سہلاتا ......چیختا چلاتا ......شور مچاتا ......انجانی منزل کی تلاش میں سرگرداں آگے بڑھے جا رہا ہے۔

مردہ خانہ

لفظ سکھائے جا رہے تھے عمروں کا فرق اور معاشرے کی روایات بیچ درمیان ایستادہ کھڑی تھیں۔

زندگی کیا ہے......؟؟؟ مسلسل کثافتوں کو سمیٹتے ہوئے لمحات، کبھی مقام کا ڈر، کبھی بھرم ٹوٹ جانے کا اندیشہ، کبھی نام غارت ہو جانے کا خوف......ایک لکیر پر چلنے والے کا نام تو زبان زدِ عام ہو سکتا ہے مگر اس کشٹ کو کون جان سکتا ہے جو اُس نے اِس سفر میں کاٹا ہوتا ہے۔

لفظ سکھائے جا رہے تھے......عمروں کا فرق اور معاشرے کی روایات بیچ درمیان ایستادہ کھڑی تھیں۔

اُس نے اپنی آرزو کو زبان پر لانے کی کوشش کی مگر ہکلاتے ہوئے۔ٹھیک طرح سے ادائیگی کرنا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی......سماج اُس پر سنگ باری کرتا اور دِل کا آئینہ کرچی کرچی ہو جاتا......وہ جنسِ مخالف کی حلاوت کو محسوس کر سکتا تھا کبھی ہاتھوں کے لمس کے ذریعے تو کبھی آنکھوں آنکھوں میں ہی وہ ساری سرحدیں پار جاتا......ہاں سرحدیں۔

وہ سرحدیں جو حقیقت میں پار کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھیں......اُس کے اندر پھیلا اشتعال کرب کو جنم دے رہا تھا اور اس کرب کو ختم کرنے کیلئے اُس کے قرب کی ضرورت تھی......وہ کھلی وادیوں میں اس کے ساتھ سفر کرتا......جہاں پھولوں کی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول چاروں اور پھیلے ہوئے تھے......اُس نے کھڑے پانی میں کنکر پھینکا۔

آواز اُٹھی اور چاروں جانب چل دی اور چلتے چلتے راستے میں ہی کہیں ختم ہو گی......وہ لفظوں، جملوں، سے زیادہ تو جواب اُسے دے رہا تھا۔

وہاں کئی آئے اور ٹھکرا دیئے گئے......اُس کے چہرے کی رنگت کھلی ہوئی تھی......اُس کا

جسم اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آتشیں ہو چکا تھا ......اُس کا کنوارا پن اپنے اندر کی چمک عیاں کئے جا رہا تھا......بکھرے لمبے سیاہ بال شانوں سے ہوتے ہوئے نیچے کو لٹک رہے تھے......دُھوپ میں چہرے کی سرخی دُوگنی ہوئے جا رہی تھی۔

وہ لفظ پڑھاتی ...... جملے لکھاتی ......اور یہ خوابوں کی دُنیا میں کہیں ہچکولے کھاتا پھرتا رہتا ......وہ لمحات اُسکی ذات کیلئے شانتی بھرے ہوتے تھے ......اُس وقت کو وہ اپنا قیمتی اثاثہ گردانتا وہ اُس کے ساتھ عکس تراشتا ......اُس کے لفظوں کو ملا ملا کر جملے بناتا اور اپنے جملوں کے سحر میں کہیں کھو جاتا ......تمام عمر کے ساتھ رہنے کا عہد۔

وہ خود کلامی کر رہا تھا ......عمروں کا فرق اور معاشرے کی روایات بیچ درمیان استادہ کھڑی تھیں ......وہ گھنٹوں اُس سے باتیں کرتا ......وقت ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوتا تھا۔

نگاہوں میں اب لپک تھی اور الفاظ ذو معنی اُوڑھنی اُوڑھے زبان سے پھسل جاتے اُسے کچھ احساس ہو چکا کہ کچھ تو ہے۔

مگر کیا......معلوم نہیں ......وہ اُس کے ساتھ دُنیا سے دُور کسی ویران وادی میں رہنے کا متمنی تھا۔

اُپنی گمشدہ جنت کی تلاش میں سرگرداں ......اپنی محبت کو ساتھ لیکر دُنیا کی رَسموں سے بے نیاز، پرسکون ماحول اور طمانیت کے حصول کی تلاش میں اُٹھ کھڑا ہو۔

دھیرے دھیرے ارادے کی پختگی کے ساتھ ساتھ منزل کی جانب قدم بھی رَواں دواں ہو چلے۔

لفظ سکھائے جا رہے تھے...... جملے بنائے جا رہے تھے۔

وہ کشش و پیچ میں مبتلا تھا ......سر جھکائے اشارۂ آبرو کا منتظر ......خیالات میں اپنے من پسند رنگوں کو اپنے محبوب کے تن پہ سجا دیکھنے لگا۔

وہ کس کی تلاش میں سرگرداں تھا ......حیرت اور استعجاب کے ساتھ نئی راہوں کی جانب گامزن ......وہ کس مقام پر کھڑا ہونا چاہتا تھا ......زمان و مکان نے تو سب کو اپنے حصار میں بند کر رکھا تھا......پھر مقام کا تعین کرنے میں کیا دُشواری حائل تھی ......اُس نے ہاتھ بڑھایا ......اُنگلیوں کا چھونا تھا کہ ایک عجیب سی لہر ماتھے سے اُٹھی اور پورے وجود میں کوند گئی ......دِل تیزی سے دَھک دَھک کرنے لگا تھا......نگاہوں سے وابستگی چھلک رہی تھی ......اُنسیت رگ و پے میں دوڑنے لگی۔

اُس لمحے آنکھیں مخموری ہوگئیں تھیں ......پے دَر پے ٹھکرائے گئے اُس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔
اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے، ہاتھ اُبھر چکے تھے......اَندر ہی اَندر سرور بھری لہر اُٹھی اور کہیں اَندر ہی دَم توڑ گئی۔
وہ چلاتے ہوئے کہنے لگی......تم نے یہ صفحات زبانی یاد کرلیے۔
ہاں......ہوں......اور بس......وہ اس سے آگے نہیں بول پایا۔
وہ خوابوں سے نکل کر نظروں کے سامنے حقیقت کے طور پر دکھائی دے رہی تھی۔عجیب سی کیفیت اُس پر طاری ہوچکی تھی۔کئی رَنگ اُبھرے اور اُبھرتے ہی بھسم ہوگئے۔
زندگی......ہاں زندگی......جسم اور روح کا حسین امتزاج......روح جس کو ابد تک سفر کرنا ہے اور جسم جس نے لذتوں کو سمیٹ کر انجام کو جا پہنچنا ہے۔
جسم اپنی لذتوں کی خاطر مسلسل پامال ہوئے جارہا تھا......کبھی سکون کے نام پر......کبھی منزل پالینے کی خاطر......کبھی خوشی اور شادمانی کے حسین دھوکے میں مبتلا ہوکر۔
میں تم کو چاہتا ہوں......یہ لفظ دِل سے اُٹھے اور لبوں تک آتے آتے راستے میں ہی ختم ہوگئے......محبت جنس کا دُوسرا نام ہے۔جو جنس، جنس، جنس اور بس جنس پر ہی اختتام پذیر ہے۔وہ کہہ رہا تھا۔میں صرف تمہارا تھا......تمہارا ہوں......تمہارا ہی رہوں گا۔
اب خوابوں سے نکل کر سامنے آؤ......حقیقت کا رُوپ دھار کر ہمیشہ میرے پاس رہو......ہم لمبی اور طویل مسافت میں حائل رکاوٹیں ایک دُوسرے کے سنگ پار کریں گے۔وہاں ہم اپنی مرضی سے ایک نئی دُنیا آباد کریں گے۔سب سے الگ تھلگ......جہاں ہمارا اپنا مسکن ہوگا۔جہاں ہماری ہر بات مانی جائے گی۔کثافتوں سے پاک لطافتوں سے مزین زندگی جئیں گے۔جہاں مدہوشی ہوش......اور ہوش مدہوشی ہوگی......جہاں پھولوں کی قطاریں ہوں گی۔ہر قطار میں مختلف رنگ کے پھول کھلے ہونگے......پھولوں کی اپنی اپنی مہک ہوگی۔ہر پھول اپنی دنیا میں لہک رہا ہوگا۔پتیاں اپنے اندر مختلف رنگ سمیٹے ایک ہی حصار میں کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر جھوم رہی ہونگی۔جہاں موتی کے جیسے چمکتا پانی ہوگا۔جس میں ہر پھل کا ذائقہ پایا جائیگا۔جہاں پیڑ بن اور پیڑ اپنی مثال آپ ہونگے۔خاموشی بھی جہاں باتیں کرے گی۔
دلآویز مسکراہٹ لبوں کو تر کردے گی اُن لمحوں کو ہم اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ جئیں گے......تمہارے لمبے کھلے بال ہوا کے دُوش پر حرکت کریں گے اور تم آئینے کی مانند چمک

لیئے آنکھوں کو خیرہ کیے جاؤ گی ......وہاں روشنی ہو گی اور ہم اُس روشنی سے اپنا لباس بنائیں گے ......پھر سائے ختم اور وسوسے ابدی نیند سو جائیں گے ......نفس کو قابو کرنے اور خودداری سے جینے کا جو سبق ہم نے تسبیح کے دانوں کی مانند دن رات گنا وہ ہمیں اعلیٰ مقام پر ضرور فائز کرے گا ......کوتاہیوں کی معافی ہو گی اور ہم معراج پا لیں گے ۔

صبر و استقامت پر چلنے والے کبھی ناکام نہیں ٹھہرتے دیر سے ہی پر منزل پا لیتے ہیں ۔پھر ارفع مقام ان کی قدم بوسی کرتا ہے ۔امید اور یقین کے درمیان ایک عالی مقام ہے ۔وہ مقام ہمارا ہے، ہم اپنا مقام پا کر نہال ہو جائیں گے ۔چاند، ستارے ہمارے گرد طواف کریں گے ۔اُن کی روشنی ہماری روشنی کے سامنے مانند پڑ جائیگی ۔

ہم نے انہی باتوں کو زیست کے سفر میں نچوڑ نچوڑ پیالے بھرے ......جن سے عرفان وآگہی ملے گی ......اِس پگڈنڈی پر ہمارا سفر مدارج سر کرتا ہوا ......اُس مقام تک جا پہنچا ئے گا ......خوف اور ڈر کے بادل ایسے بھاگ کھڑے ہونگے جیسے سورج کے نکلتے ہی سائے بھاگ جاتے ہیں ہمیں امن اور شانتی کی وہ قبا ملے گی ......جس کے بعد بے قراری ......بے رُخی ......بے ربطی ......بے رنگی ......بے زاری ......بے دخلی ......نہیں ہو گی ......پھر قرن در قرن ......، زمانہ در زمانہ ......گزرے گا ......وقت کی ساعتیں تھک جائیں گی ......ان کی ہمت نا ہو گی کہ دو گام چل پائیں ......ہم ہوا کے دوش پر کبھی یہاں تو کبھی وہاں جا ٹھہریں گے ......بے نیازی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہو گی ......اِس فیاضی پر ششدر ہونے کی ضرورت نہیں ......یہی وعدہ تھا ......وعدہ ہے ......وعدہ رہے گا ......وہاں وعدے کے خلاف نہیں ہوتا ۔

رفاقت اور قربت کی حدود اس قدر نزدیکیوں میں بدل جائیں گی ......کہ میں اور تم ......ہم بن جائیں گے ......ایک سکے کے دُو رُخ ......سکہ ایک ۔

تم جس جسمانی اذیت سے تنگ ہو ......یہ عارضی ہے ......اِس کا دُکھ کچھ بھی نہیں ......اِس کرب کی کوئی وقعت نہیں ......اچانک وہ خیالات کے بھنور سے ہچکولے کھاتا ۔

حقیقت میں آ گرا ......سامنے سڈول جسم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز تھا ......اُس کی انگلیوں کے لمس میں کیا تھا کہ لمحوں میں تن بدن آگ بگولا ہو گیا ۔جنسی اشتہا کشش اور جاذبیت کی بکل مارے مضطرب کر رہی تھی ......آنکھوں کے اشارے میں نجانے کیا تھا ۔بے چینی برداشت سے باہر ہونے لگی ......دونوں پھسلنے لگے ......لفظ سکھانے والی ......جملے بنانے والی ......کیوں بہک سی گئی تھی ۔

پڑھنے والے نے سارے جملے سرتا پا پڑھ لئے ......ورق ورق اول تا آخر روند ڈالا ......وجود میں سفر کرتی انجانی سی اُلجھن اپنے انجام کو جا پہنچی ......اُس کی کوکھ پھولنے لگی...... کچھ دِنوں بعد دُونوں بندھن میں بندھ گئے ......دو بول کیا پڑھے گئے وہ آپے سے باہر ہو کر غرور و نخوت کا شکار ہونے لگی۔

عورتیں زبان کے چٹخارے کی خاطر کہہ رہیں تھیں۔

اجی ......حد درجہ بے شرم نکلی ......معصوم کو جال میں پھنسا کر اپنا خصم بنا لیا۔ایسی کالی کلوٹی کو کہاں ایسا چاند سے مکھڑے والا ملنا تھا......عمر میں بچوں کے برابر۔

دُوسری ناک کان چھوتے ہوئے کہنے لگی ......اِس کی بھانجی بھی ساتھ والے اسکول میں معلّمہ تھی......ناک پہ مکھی بیٹھنے نہیں دیا کرتی تھی۔

سکول مالک کے بیٹے پہ ایسے ڈورے ڈالے کہ آج چار بچوں کی ماں ہے۔

ساتھ والی نے اپنی کرسی گھسیٹی اور سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگی......ارے اِن کی کون کون سی بات کی جائے ......تمھیں پتا ہے وہ پرائیویٹ سکول والی،ساتھ والیوں سے،استغفار استغفار......سرگوشی سننے والیوں نے یکدم کانوں کو چھوا اور برا سا منہ بنایا......وہ اِس کی دُوسری سہیلی جس کا خاوند دوبئی سے خاصی رقم بھیج دیتا ہے وہ یہاں خوب گُل کھلائے جا رہی ہے......ہر وقت کھڑکی سے لٹکے گلی میں آتے جاتے مردوں کو گھورتی رہتی ہے......ساتھ بیٹھی نے لقمہ دیا۔

ہائے رے......وہ ٹھگنی بطخ کی چال والی اپنی تنخواہ پہ اترائے پھرتی ہے......خاوند کو بات بات پہ ذلیل کرے اور طعنے دے وہ بے چارہ اپنا سا منہ لئے سوچے ہے کہ کیا کرے......کیا نہ کرے......دائیں جانب بیٹھی نے بحث میں اپنا حصہ ڈالا۔

ارے بہن......منہ پھٹ......مرد کھائی......جورو کی مثال کتیا کی مانند ہووے......لاڈ کرو......منہ چاٹے......اوقات میں رکھو تو پاؤں چاٹے۔

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

دماغ سے نہ سوچا کرو، دِل کے ترازو سے تول کر لیا کرو۔یہی درست کسوٹی ہے۔وہ معلّمہ تھی،تعلیم کیا تھی؟عشق اور محبت،جسم کو راحت دینے والی چاہت، محبت جو گھس پٹ کر ایک جانب کھڑی تھی اور عشق وہ دیوانہ پن جو منزل پا لینے کے لیے ہمیشہ مستعد رہا......پڑھنے پڑھانے ،سیکھنے سکھانے کے عمل میں اس کا یوں وارد ہو جانا محال تو تھا،مگر اتنا بھی نہیں کہ اِس پہ اعتماد نہ کیا جا سکے،دُونوں انسان تھے۔

پھر کیا ہوا ...... معلّمہ بڑی عمر والی تھی، (آخر تھی تو عورت) جوان، جاذبِ نظر، پسینے میں اُسکے بھرے بدن کی پھیلتی خوشبو، سحر انگیز سلوٹیں، آتشِ نفس کو ارتعاش دینے کو کافی تھیں ...... گرم سانسوں کا ملنا دھیرے دھیرے دھڑکن بے ربط ہونے لگی۔ خوف اور سرور کی ملی جلی کیفیت نے اُسے مسحور کن حصار میں جکڑ لیا تھا۔ وہ قدرے گھبرائی اُسکی حلاوت بھری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے غیر اِرادی طور پر چھت کو گھورنے لگی۔

وہ جوانی کی دہلیز پر کب کا قدم رکھ چکا تھا۔ عمر کا تفاوت دس بارہ کا تھا مگر دس بارہ کا ہندسہ کونسا بڑا ہندسہ ہے۔ وہ کسی خیال میں گھومتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

ہم دُوسروں کی جانب اُنگلی اُٹھانے سے قبل اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے۔ کسی سے اختلاف ہوجانے کے بعد زمین آسمان کے قلابے ملا کر الزامات کی بوچھاڑ کیوں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اُس نے قلم سامنے میز پر رکھا اور سارے صفحات ہوا میں اچھال دیئے۔



ساجد خان کے بعض افسانوں کی قرأت کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ایک ایسا تخلیقی فنکار ہے جس نے علوم اور علم کے ضابطوں کی حدود سے بہت آگے نکل کر اُن رمز بھرے حقائق کو گرفت میں لیا کہ جن پر دسترس حاصل کرنا ہر لکھنے والے کا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اُس نے افراد کے جن ابنارمل روّیوں کو پیش کیا ہے ان میں سے چند ایک ایسے نازک روّیے ہیں کہ جو ابھی تک نفسیات کی اصطلاحوں کی گرفت میں نہیں آسکے۔ ساجد خان کے ہاں تکنیکی تنوع موجود ہے جس کی بدولت وہ خارجی مظاہرِ فطرت کے ساتھ لاشعوری اور تحت الشعوری مظاہر کو بھی سہولت کے ساتھ کاغذ پر اتار لیتا ہے۔ اس کے افسانوں میں باطن کا سفر ایک نئے صوفیانہ آہنگ کی پہچان کراتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ تکنیکی ندرت کے ساتھ مشکل ترین مرحلوں سے باسہولت گزر جاتا ہے۔ ساجد خان کی لفظوں پر گرفت بھی خاصی مضبوط ہے اور وہ کہیں بھی افسانوی ادب میں نووارد ہونے کا تأثر نہیں چھوڑتا۔

(ڈاکٹر رشید امجد)

ساجد خان کے افسانوں کی فنی خوبی یہ ہے کہ وہ سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ غور و فکر کا عادی ہے۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں نے اسے حساس بنا دیا ہے اور وہ غلاظتوں کی نشاندہی کرنے پر قادر ہے۔ ساجد خان تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ اُس کا ذہن فلسفیانہ ہے اور وہ انسانی کمزوریوں کا ادراک بھی رکھتا ہے۔ وہ مسائل کا فلسفیانہ تجزیہ کرنا جانتا ہے جو اس کی فن کاری کا مثبت اور روشن پہلو ہے۔ اس کے ہاں الفاظ کے بہاؤ اور خیالات کی روانی میں تیزی و تندی ہے...... وہ جذبات کی رو میں بہت دُور تک نکل جاتا ہے جو اس کی فنِ افسانہ پر دسترس کا ایک واضح ثبوت ہے۔

(محمد بشیر رانجھا)

ISBN 978-969-9965-07-4

Rs. 250.00
US $. 40.00

سلطان پبلشرز
Sultan Publishers